دارالعلوم کراچی کا ترجمان
ماہنامہ
البلاغ
ماہ ذیقعدہ ۱۴۱۰ھ / جون ۱۹۹۰ء
بانی
مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ

جلد ۲۴

ذیقعدہ ۱۴۱۰ھ / جون ۱۹۹۰ء

شمارہ ۱۱

قیمت فی پرچہ چھ روپے

سالانہ ستّر روپے

نگراں :

حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی

مدیر :

محمد تقی عثمانی

ناظم :

شجاعت علی ہاشمی

سالانہ بدل اشتراک :

بیرونِ ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک و رجسٹری :

ریاستہائے متحدہ امریکہ / ۲۸۰ روپے ، برطانیہ ، جنوبی افریقہ ، ویسٹ انڈیز ، برما ، انڈیا ، تھائی لینڈ ، ہانگ کانگ ، نائیجیریا ، آسٹریلیا نیوزی لینڈ / ۲۲۰ روپے (بنگلہ دیش / ۱۸۰ روپے) سعودی عرب ، عرب امارات ، مسقط ، بحرین ، عراق ، ایران ، مصر ، کویت / ۲۰۰ روپے

پبلشر : محمد تقی عثمانی دار العلوم کراچی
پرنٹر : مشہور آفسٹ پریس ، کراچی

خط و کتابت کا پتہ : ماہنامہ "البلاغ" دار العلوم کراچی ۱۴
فون نمبر : ۳۱۱۳۱۷

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا عزیز الرحمٰن
استاذ دارالعلوم کراچی

ذکر و فکر:

حمد و ستائش اس ذات کیلئے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا

— اور —

درود و سلام اس کے آخری پیغمبر پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا

ہر سال کی طرح اِس سال بھی مُلک بھر میں دو ماہ کی تعطیل کے بعد وسط شوال سے عربی مدارس دوبارہ کھُل گئے اور ابتدائی دینی معلومات سے لیکر، تحقیق و نظر کے دقیق مباحث پر مشتمل درس و تدریس اور علمی مکالمات سے یہ درسگاہیں معمور ہو گئیں، قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں ایسی شیریں اور سکون بخش صدائیں ہیں جو عقل و شعور کو جِلا بخشتی ہیں، قلب کو حرارت و طمانیت اور علم و آگہی کو پختگی عطا کرتی ہیں، کرۂ زمین پر دین و شریعت کی یہ درسگاہیں اپنے اعلیٰ ترین مقاصد کی رُو سے مسجد کی طرح مقدس ہیں اور ان سے وابستہ اخلاص و للّٰہیت کے مجسّم نمونے، اللہ تعالیٰ کے وہ خوش نصیب بندے ہیں جنہیں وسیع تر کائنات میں علومِ نبوت اور وحی الٰہی کے تحفظ اور نشر و اشاعت کیلئے چُن لیا گیا ہے، یہ وہ بندگانِ خدا ہیں جن کے شب و روز اس کائنات کے سب سے

مقدّس مُبارک اور قیمتی مشغلے 'دینِ حنیف کو سمجھنے اور سمجھانے میں بسر ہوتے ہیں ـــــ ان درسگاہوں سے وابستہ ہر فرد اپنے اپنے ظرف کے مطابق اِس میدانِ عمل کا سپاہی ہے اور کثیر تعداد ایسے رجال عزیمت کی ہے جو اِس راہ میں قلندرانہ شان سے سرگرمِ عمل ہیں، رنگ و بو کی چار سو پھیلی ہوئی دُنیا، اِس کی چمک دمک اور اس کی رونقیں اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں کے باوجود، اس حلاوت و لذّت کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی جن کا ادراک بحرِ علم کے یہ شناور کرتے رہتے ہیں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

علومِ نبوّت کے اشتغال میں یہ حضرات وراثتِ صحابہؓ کے امین ہیں، تشنگانِ علم کو سیراب کرنے کا عزم رکھتے ہیں اور رضائے الٰہی کا حصول ان کا اصل مطمحِ نظر ہے۔

برِ صغیر پر بدیسی استعمار کے بعد جب مسیحیت اور ارتداد کی یلغار آئی تھی اور اس پورے خطّے سے اندلس کی طرح اِسلام اور مُسلمانوں کا بیج مارنے کی ہمہ گیر منصوبہ بندی کی گئی تھی تو اس وقت یہی وہ مدارس تھے جو اس طوفان قہر و جبر میں علومِ نبوّت اور اقدارِ دین کو بچانے کے قلعے ثابت ہوئے ، خندق نما کوٹھریوں میں چٹائیوں پر بیٹھ کر ، ظاہری شان و شوکت اور قوّت و سلطنت سے یکسو علمائے ربانیین نے دین کی شمع فروزاں رکھی، ان مدارس کا وجود اس علاقے کے مسلمانوں پر ، اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے ، برِ صغیر کے مقابلہ میں اگر عالمِ اسلام کے دیگر خطّوں کا موازنہ کر کے دیکھا جائے تو آج ایسے علاقوں کی کمی نہیں ہے جہاں اقتدار پرستی کی ہوس اور جھوٹے انسانی نظریات کی پرستش نے ملک کے ملک بنجر کر ڈالے ہیں اور دینی تشخص سے محروم مُسلمانوں کی نسلیں باطل کے نرغہ میں ہیں۔

خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی یہ مدارس خیر کے سرچشمے ہیں، کسی سرکاری ادارے کے بجٹ پر ان کا کوئی بوجھ نہیں ہے، قوم کا وہ مختصر ترین طبقہ جو دین کی خیرخواہی کی تڑپ رکھتا ہے، اس طبقہ کے فاضل سرمایہ کا کچھ تھوڑا سا حصہ ان مدارس کا "ذریعۂ آمدنی" ہے اور اس آمدنی کو تول تول کر، سادگی، کفایت شعاری کے ساتھ برمحل استعمال کرنے کی امکانی کوشش کی جاتی ہے، مدارس کو ملنے والی یہ رقم صرف تعلیم کے ہی نہیں بلکہ مستحقین کی کفالت کے بھی کام آتی ہے، رقم کے اِس بہترین، دوہرے استعمال کے ساتھ یہ بات بھی بالکل بدیہی ہے کہ ان مدارس میں تعلیم کا یومیہ اور سالانہ دورانیہ عام تعلیمی اداروں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے، یہاں بفضلہٖ تعالیٰ نہ ہڑتال ہوتی ہے اور نہ کلاشنکوف اور ٹی ٹی کا کاروبار ہوتا ہے، کفالت و

تعلیم کا یہ دوہرا کام اِس لحاظ سے بھی حیرت انگیز ہے کہ ان دونوں کاموں پر اُٹھنے والے فی کس مصارف ناقابلِ یقین حد تک کم ہیں۔

پرائمری اور مڈل کے بعد ایک طالب علم مزید آٹھ نو سال تک شریعت و عربیت کے علوم میں منہمک رہتا ہے اور یہ پورا عرصہ حصولِ علم کی بہترین کوششوں میں صرف ہو جاتا ہے، یہاں کے اساتذہ اسکولوں اور کالجوں کی طرح، کرسی پر متمکن ٹیبلوں پر پاؤں پھیلائے وقت گزاری نہیں کرتے نہ اپنے شاگردوں میں سے کسی کو اپنا گاہک بناتے ہیں، طلبہ بھی اپنے اساتذہ کا احترام کرتے ہیں، تواضع سے پیش آتے ہیں اور اپنے اساتذہ سے عقیدت رکھتے ہیں، کسی طالب علم کا اُستاذ کو آنکھیں دکھانا یا امتحان کے موقع پر دھمکی یا لالچ کے حربے بروئے کار لانا ایسے خیالات ہیں، جن کا بحمداللہ مدارس کی فضاء میں کوئی گذر نہیں ہے۔

بعض لوگ ان مدارس سے اِس طرح کی توقع قائم کرلیتے ہیں کہ ان سے نکلنے والے کو کسی دفتر، مارکیٹ یا فیکٹری کا بھی کوئی کارکن ہونا چاہیئے، انہیں اِس کی بڑی جستجو ہوتی ہے کہ اِتنی بڑی تعداد کہاں کھپ سکتی ہے، حالانکہ یہ ایسی بات ہے جو آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے، ابنائے وطن کو اگر اچھے ڈاکٹر، اچھے انجینئر اور اچھے ہنر مند کی ضرورت ہے تو انہیں اپنے دین کے ناطے پختہ کار عالمِ دین کی بھی ضرورت ہے اور یہ ضرورت مسلسل باقی ہے، مدارس قوم کیلئے اِس پیداوار کا انتظام کرتے ہیں، اور وہ اپنے مخصوص دائرۂ کار میں مصروفِ عمل ہو جاتے ہیں، جس طرح کسی ڈاکٹر سے درزی اور بڑھئی کا کام نہیں لیا جاتا اسی طرح کسی مستند عالمِ دین کو بھی اپنے دائرۂ کار کے علاوہ کسی دوسری جگہ لگانے کا خیال کرنا، حقیقت پسندانہ سوچ نہیں ہے۔

خیر کا یہ ذکر بلاشبہ بڑا دل خوش کُن ہے لیکن خود اہلِ مدارس کو بھی اپنے حالات کا جائزہ لینا چاہیئے، ـــــ کیا ایسا نہیں ہے کہ مدارس کا معیار تیزی سے رو بہ زوال ہے، علمی استعداد گھٹتی جارہی ہے، تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کی طرف کوئی دھیان نہیں ہے،

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت و سیرت جس کا اہتمام ہر نشست و برخاست میں ہونا چاہیئے تھا اب محدود ہو کر رہ گیا ہے، رائج الوقت رسّہ کشی کی سیاست جس نے ابنائے وطن کو عذاب میں مُبتلا کیا ہوا ہے اور جس کی وجہ سے ہر طرف منافرت کی آگ بھڑکی ہوئی ہے، ملک کی سالمیت و استحکام بھی جس کی وجہ سے داؤ پر لگا ہوا ہے ـــ سیاست کی اِس کیچڑ سے اب یہ مدارس بھی آلودہ ہو رہے ہیں اور ان میں بھی گروہی رقابتیں جنم لے چکی ہیں، طلبہ

اور اساتذہ کے باہمی نظریات میں تصادم ہے اور غور و فکر کا بڑا حصہ خالص علمی مشاغل کے بجائے اپنے اپنے افکار و نظریات کی تائید و اشاعت میں صرف ہو رہا ہے، بعض مدارس عملاً بھی سیاست میں سرگرم ہیں اور ان کی عمارتوں پر باقاعدہ جھنڈے لہراتے نظر آتے ہیں، سیاست دین حنیف کا بلاشبہ اہم ترین حصہ ہے اور اس میدان کو صرف اہلِ زیغ کے لئے خالی چھوڑنا خودکشی سے کم نہیں ہے۔ لیکن تقسیم کار کے اصول کے تحت حصولِ علم اور مشغلۂ سیاست عملاً یکجا نہیں ہو سکتے۔

سیاست کے کوچے میں قدم رکھنے والا علم کے راستہ میں پیش قدمی کا اہل نہیں رہتا، بالخصوص آج کی گندی سیاست تو تعلیمی اداروں کے لئے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتی ہے جس کی تباہ کاریاں ہر آنکھ والا روزانہ دیکھ سکتا ہے۔

جاہ پرستی اور مادی آسائشوں کا رجحان بھی مدارس کی فضا میں داخل ہو گیا ہے یہ جراثیم یوں تو انسانی جبلت کا لازمہ ہیں لیکن اب تک کا مدارس کا خانقاہی ماحول ان جراثیم کو پنپنے نہیں دیتا تھا، اب اندیشہ ہے کہ مدارس کی تیزی سے بدلتی ہوئی فضا ان جراثیم کو مغلوب رکھنے کے بجائے پروان چڑھانے کا ذریعہ بنے گی اور خاکم بدہن پھر ایسا نہ ہو کہ یہ مدارس خیر کا وسیلہ بننے کے بجائے فکری انتشار اور عملی بے راہ روی کا ذریعہ بننے لگیں، اس طرح ان کو بے اثر بنانے اور فنا کے گھاٹ اتارنے کے لئے کسی خارجی قوت قاہرہ کی بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اعاذنا اللہ من ذالك۔

المیہ یہ ہے کہ علمی استعداد اور کتاب سے مناسبت کا ایسا لگتا ہے، ستیاناس ہو کر رہ گیا ہے۔ درجاتِ عالیہ میں داخلے کا امیدوار طالب علم کسی بھی علم و فن کی ابتدائی اصطلاحات سے بھی نابلد ہے نہ اس کو قواعد کے مطابق صحیح عبارت پڑھنے کا سلیقہ ہے، ملک کے طول و عرض میں ہر سال ایک بڑی تعداد دستارِ فضیلت سے سرفراز ہوتی ہے، لیکن رجل رشید کی تلاش پھر بھی ہمہ وقت جاری ہے۔

یہ وہ حالات ہیں جن کا اگر سدباب نہ کیا گیا تو ان کے نتائج بڑے ہولناک ہو سکتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ ہم لاشعوری طور پر اپنے پاؤں پر کلہاڑا چلا رہے ہوں اور اپنے ظاہری سج دھج سے مطمئن ہوں ـــــ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی صف میں شامل ہونے سے ہماری حفاظت فرماتے جن کے بارے میں ارشاد ربانی ہے۔ قل هل ننبئکم بالاخسرین

أعمالاً الذين ضل سعيهم في الحياة الدنيا وهم يحسبون أنهم يحسنون صنعًا۔

رجب ۱۳۹۱ھ کے شمارے میں محترم مدیر البلاغ دامت برکاتہم نے اس موضوع پر اظہار خیال فرمایا تھا اور نہایت اہم اُمور کی طرف توجہ مبذول فرمائی تھی، یہ آج سے ۲۰ سال قبل کی بات ہے جبکہ مدارس باوجود انحطاط پذیر ہونے کے تنزل کی اس کیفیت سے دو چار نہیں تھے جو کیفیت آج نظر آرہی ہے :۔

"ہم جس ہمہ گیر دینی و اخلاقی زوال کے دور سے گزر رہے ہیں، اس کے دور دور بیٹھ کر شکوے کرنے کے بجائے، اپنے اپنے گریبانوں میں منہ ڈالیں اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ ہم خود اس زوال سے کس حد تک متاثر ہوئے اور کس حد تک اس کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے، یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں کہ اس عام زوال کا اثر ہمارے دینی اداروں، دینی جماعتوں اور درسگاہوں تک پہنچا ہوا ہے — لہٰذا اُمت کی عمومی اصلاح اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک ملت کا وہ طبقہ اپنی اصلاح کی فکر نہ کرے جسے عوام کی رہنمائی کا مقام حاصل ہے۔"

"دینی مدارس میں اصل رُوح جو مرورِ ایّام سے دھیمی پڑتی جارہی ہے، از سرِ نو تازہ کرنے کے لئے سب سے اہم ذمہ داری ان درسگاہوں کے اساتذہ اور منتظمین پر عائد ہوتی ہے، ان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ پہلے اپنے ذاتی اعمال و اخلاق کا جائزہ لیکر یہ دیکھیں کہ اسلامی علوم نے ان میں اپنا کوئی رنگ پیدا کیا ہے یا نہیں؟ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت میں کتنا اضافہ ہوا؟ اللہ کے ساتھ تعلق کتنا بڑھا؟ عبادت کے ذوق میں کتنی زیادتی ہوئی؟ جن فضائل اعمال کی دوسروں کو شب و روز تلقین کی جاتی ہے ان پر خود کتنے عمل پیرا ہوئے؟ جس انفاق فی سبیل اللہ کی دوسروں کو بڑھ چڑھ کر تاکید کی جاتی ہے اس میں خود ہم کس قدر حصہ دار بنے؟ دین کی خاطر جان و مال کی قربانی دینے کے جذبے نے کتنی ترقی کی؟ معاشرے کے بگاڑ سے کرب و اضطراب کی کیفیت اور اس کی اصلاح کی فکر کس حد تک دل و دماغ پر طاری ہوئی؟ یہ ساری باتیں ہمارے اپنے سوچنے کی ہیں۔"

ضرورت اِس بات کی ہے کہ ان مدارس کو اُن رسمی اداروں کی طرح نہ چلایا جائے جو محض معاشی بہبود اور منصب اختیارات کا وسیلہ ہوتے ہیں بلکہ پوری دینی مسئولیت، اور احساس امانت سے سرشار ہوکر ان مدارس اور ان سے وابستہ کارکنان وطلبہ کو بھرپور اہتمام کے ساتھ دینی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جائے، دینی تعصلب اور علمی رسوخ اوّلین ہدف ہو اور ہماری ہر نقل وحرکت اِسی مرکز دائرہ کے تابع ہو —— اِس مقصد کے لئے اصحاب مدارس اگر آپس میں بیٹھ کر باہمی مذاکرہ کرلیا کریں اور اصلاحِ حال کی فکر دامن گیر ہوجائے تو بعید نہیں ہے کہ یہ مدارس پھر اپنے سابقہ مقام پر واپس آجائیں،

چار سو بگاڑ کے اِس ماحول میں آج اگر خیر کا کوئی کام ہو رہا ہے تو انہی مدارس کے ذریعہ ہو رہا ہے، ایسا نہو کہ ہماری کوتاہیوں کی وجہ سے یہ شمع، جس کی لو بہت مدھم ہوچکی ہے، بالکل ہی بجھ جائے —— سالِ نو کا آغاز ہمیں اپنے طرزِ عمل کا جائزہ لینے کی دعوت دیتا ہے۔

ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اس سے کہ ہمارا عمل بیکار ہو اور ہماری منزل کھوٹی ہو۔

آمین

عزیز اکرم

۲۳ شوال ۱۴۱۰ھ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رح

تقسیم معیشت کا قدرتی نظام

معارف القرآن ، سورۃ الزخرف ، آیت ۳۱ و ۳۲

خلاصہ تفسیر

(یہ تو کافروں نے قرآن کے بارے میں کہا) اور (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں) کہنے لگے کہ یہ قرآن (اگر کلام الٰہی ہے اور بحیثیت رسالت آیا ہے تو) ان دونوں بستیوں (یعنی مکہ اور طائف کے رہنے والوں) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا (یعنی رسول کے لئے عظیم الشان ہونا ضروری ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مال اور ریاست نہیں رکھتے تو یہ پیغمبر نہیں ہو سکتے۔ باری تعالیٰ ان کے اس شبہ کی تردید فرماتے ہیں کہ) کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت (خاصہ یعنی نبوت) کو (خود) تقسیم کرنا چاہتے ہیں (یعنی یہ چاہنا کہ نبوت ہماری رائے کے مطابق لوگوں کو ملنی چاہیئے گویا خود تقسیم کرنے کی ہوس کرنا ہے کہ یہ تقسیم ہمارے سپرد ہو حالانکہ یہ ہوس نری نادانی ہے کیونکہ) دنیوی زندگی میں (تو) ان کی روزی ہم (ہی) نے تقسیم کر رکھی ہے اور (اس تقسیم میں) ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے تاکہ (اس سے یہ مصلحت حاصل ہو کہ) ایک دوسرے سے کام لیتا رہے (اور عالم کا انتظام قائم رہے) اور (ظاہر اور یقینی بات ہے کہ) آپ کے رب کی رحمت (خاصہ یعنی نبوت) بدرجہا اس (دنیوی مال ومتاع اور جاہ ومنصب) سے بہتر ہے جس کو یہ لوگ سمیٹتے پھرتے ہیں (پس جب دنیوی معیشت کی تقسیم ہم نے ان کی رائے پر نہیں رکھی، حالانکہ وہ ادنیٰ درجہ کی چیز ہے، تو نبوت جو خود بھی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے ———— اور اس کے مصالح بھی نہایت عظیم درجہ کے ہیں وہ کیونکر ان کی رائے پر تقسیم کیجاتی) ۔

معارف ومسائل

ان آیات میں باری تعالیٰ نے مشرکین عرب کے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کیا کرتے تھے، دراصل شروع میں تو وہ یہ باور کرنے پر ہی تیار نہ تھے کہ اللہ کا کوئی رسول انسان ہو سکتا ہے، چنانچہ اُن کا یہ اعتراض قرآن کریم نے جا بجا ذکر فرمایا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم رسول کیسے مان لیں جبکہ وہ عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں اور بازاروں میں چلتے ہیں، لیکن جب متعدد آیاتِ قرآنی کے ذریعہ یہ واضح کر دیا گیا کہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی خصوصیت نہیں، بلکہ دنیا میں جس قدر انبیاء آئے ہیں وہ سب انسان ہی تھے تو اب انہوں نے پینترا بدل کر یہ اعتراض کیا کہ اگر کسی انسان ہی کو نبوت سونپنی تھی تو حضور مالی اعتبار سے کوئی بڑے صاحب حیثیت نہیں ہیں یہ منصب حضور کے بجائے مکہ اور طائف کے کسی بڑے دولتمند اور صاحب جاہ و منصب انسان کو کیوں نہیں دیا گیا؟ روایات میں ہے کہ اس سلسلہ میں انہوں نے مکہ مکرمہ سے ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ کے اور طائف سے عروہ بن مسعود ثقفی حبیب بن عمرو ثقفی یا کنانہ بن عبد یالیل کے نام پیش کئے تھے (روح المعانی)

مشرکین کے اس اعتراض کے باری تعالیٰ نے دو جواب دیئے ہیں، پہلا جواب مذکورہ آیتوں میں سے دوسری آیت میں اور دوسرا جواب اگلی آیات میں دیا گیا ہے اس کی تشریح بھی دہیں آئے گی۔ اس پہلے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ تمہیں اس معاملے میں دخل دینے کا کوئی حق ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نبوت کا منصب کس کو دے رہا ہے اور کس کو نہیں دے رہا ہے؟ نبوت کی تقسیم تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے کہ کسی کو نبی بنانے سے پہلے رائے لیجائے۔ یہ کام کلیتہً اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور وہی اپنی عظیم مصلحتوں کے مطابق اسے انجام دیتا ہے۔ تمہارا وجود اور عقل و شعور اس عظیم کام کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا کہ تقسیم نبوت کا کام تمہارے سپرد کر دیا جاتا اور نبوت کی تقسیم تو بہت اونچے درجہ کی چیز ہے تمہاری حیثیت وجود و شعور تو اس کی بھی متحمل نہیں کہ خود تمہاری معیشت اور سامان معیشت کی تقسیم کا کام تمہارے سپرد کیا جاسکے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسا کیا گیا تو ایک دن بھی نظام عالم کو نہ چلا سکو گے۔ اور سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا اس لئے اللہ تعالیٰ نے دنیوی زندگی میں تمہاری روزی کی تقسیم بھی تمہارے ذمہ نہیں رکھی بلکہ تقسیم معیشت کا کام خود اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ جب یہ ادنیٰ درجہ کا کام تمہارے حوالہ نہیں کیا جاسکتا تو نبوت کی تقسیم جیسا عظیم کام تمہارے حوالہ کیسے کر دیا جائے۔ آیات کا مقصود کلام تو اتنا ہی ہے لیکن مشرکین کو جواب دینے کے ضمن میں باری تعالیٰ نے دنیا کے نظام معیشت

سے متعلق جو اشارے کر دیئے ہیں اُن سے متعدد معاشی اصول مستنبط ہوتے ہیں یہاں ان کی مختصر توضیح ضروری ہے۔

تقسیم معیشت کا قدرتی نظام

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ (ہم نے تقسیم کیا ہے ان کے درمیان ان کی معیشت کو) مقصد یہ ہے کہ ہم نے اپنی حکمتِ بالغہ سے دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ یہاں ہر شخص اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دوسرے کی امداد کا محتاج ہے اور تمام لوگ اس باہمی احتیاج کے رشتے میں بندھے ہوئے پورے معاشرے کی ضروریات کی تکمیل کر رہے ہیں۔ اس آیت نے کھولکر یہ بات تبلادی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تقسیم معیشت کا کام (اشتراکیت کی طرح) کسی با اختیار انسانی ادارے کے سپرد نہیں کیا جو منصوبہ بندی کے ذریعے یہ طے کرے کہ معاشرے کی ضروریات کیا ہیں؟ انہیں کس طرح پورا کیا جائے وسائل پیداوار کو کس تناسب کے ساتھ کن کاموں میں لگایا جائے اور ان کے درمیان آمدنی کی تقسیم کس بنیاد پر کی جائے۔ اس کے بجائے یہ تمام کام اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں اور اپنے ہاتھ میں رکھنے کا مطلب یہی ہے کہ ہر شخص کو دوسرے کا محتاج بنا کر دنیا کا نظام ہی ایسا بنادیا ہے جس میں اگر (اجارہ داریوں وغیرہ کے ذریعہ) غیر فطری رکاوٹیں پیدا نہ کیجائیں تو وہ نظام خود بخود یہ تمام مسائل حل کر دیتا ہے باہمی احتیاج کے اس نظام کو موجودہ معاشی اصطلاح میں "طلب و رسد" کا نظام کہا جاتا ہے۔

طلب و رسد کا قدرتی قانون یہ ہے کہ جس چیز کی رسد کم ہو اور طلب زیادہ اس کی قیمت بڑھتی ہے لہٰذا وسائلِ پیداوار اُس چیز کی تیاری میں زیادہ نفع دیکھ کر اسی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور جب رسد طلب کے مقابلے میں بڑھ جاتی ہے تو قیمت گھٹ جاتی ہے چنانچہ اس چیز کی مزید تیاری نفع بخش نہیں رہتی اور وسائلِ پیداوار اس کے بجائے کسی اور ایسے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جس کی ضرورت زیادہ ہو۔ اسلام نے "طلب و رسد" کی انہی قدرتی قوتوں کے ذریعہ دولت کی پیدائش اور تقسیم کا کام لیا ہے اور عام حالات میں "تقسیم معیشت" کا کام کسی انسانی ادارے کے حوالے نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ منصوبہ بندی کے خواہ کتنے ترقی یافتہ طریقے دریافت کر لئے جائیں لیکن اُن کے ذریعہ معیشت کی ایک ایک جزوی ضرورت کا احاطہ ممکن نہیں اور اس قسم کے معاشرتی مسائل عموماً ایسے ہی قدرتی نظام کے تابع چلتے ہیں۔ زندگی کے بیشتر معاشرتی مسائل عموماً ایسے ہی قدرتی طور پر خود طے پاتے ہیں اور انہیں حکومت کی منصوبہ بندی کے حوالہ کرنا زندگی میں ایک مصنوعی جکڑ بند پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں، مثال کے طور پر یہ بات کہ دن کا وقت کام کے لئے ہے اور رات کا سونے

کے لئے کسی معاہدہ عمرانی یا انسانی منصوبہ بندی کے تحت نہیں طے پائی، بلکہ قدرت کے خودکار نظام نے خود بخود یہ فیصلہ کر دیا ہے، اسی طرح یہ مسئلہ کہ کون شخص کس سے شادی کرے طبعی مناسبتوں کے فطری نظام کے تحت خود انجام پاتا ہے اور اُسے منصوبہ بندی کے ذریعہ حل کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔ یا مثلاً یہ بات کہ کون شخص علم و فن کے کس شعبہ کو اپنا میدان بنائے۔ اسے طبعی ذوق اور مناسبت کے بجائے حکومت کی منصوبہ بندی کے حوالہ کر دینا ایک خواہ مخواہ کی زبردستی ہے اور اس سے نظام فطرت درہم برہم ہو سکتا ہے، اسی طرح نظام معیشت کو بھی قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور ہر شخص کے دل میں وہی کام ڈال دیا ہے جو اس کے لئے زیادہ مناسب ہے اور جسے وہ بہتر طریقے سے انجام دے سکتا ہے۔ چنانچہ ہر شخص خواہ وہ ایک خاکروب ہی کیوں نہ ہو اپنے کام پر خوش ہے اور اسی کو اپنے لئے سرمایہ فخر سمجھتا ہے۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ البتہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح اسلام نے افراد کو اتنی آزادی نہیں دی کہ وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت سمیٹ کر دوسروں کے لئے رزق کے دروازے بند کر دیں، بلکہ ذرائع آمدنی میں حلال و حرام کی تفریق کر کے سُود، سٹہ، قمار اور ذخیرہ اندوزی کو ممنوع قرار دیدیا ہے پھر جائز آمدنی پر بھی زکوٰۃ، عشر وغیرہ کے واجبات عائد کر کے اُن خرابیوں کا انسداد کر دیا ہے جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں پائی جاتی ہیں اس کے باوجود بھی اگر کبھی اجارہ داریاں قائم ہو جائیں تو اُن کو توڑنے کے لئے حکومت کی مداخلت کو جائز رکھا ہے یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں، اس موضوع پر احقر کے مستقل رسالے "مسئلہ سود" "اسلام کا نظامِ تقسیم دولت" اور "اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات" ملاحظہ فرمائے جائیں۔

معاشی مساوات کی حقیقت

وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (اور ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے) اس سے معلوم ہوا کہ معاشی مساوات (اس معنی میں کہ دنیا کے تمام افراد کی آمدنی بالکل برابر ہو) نہ مطلوب ہے نہ ممکن العمل، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے ہر رکن پر کچھ فرائض عائد کئے ہیں اور کچھ حقوق دیئے ہیں اور دونوں میں اپنی حکمت سے یہ تناسب رکھا ہے کہ جس کے ذمہ جتنے فرائض ہیں اس کے اتنے ہی حقوق ہیں، انسان کے علاوہ جتنی مخلوقات ہیں ان کے ذمہ چونکہ فرائض سب سے کم ہیں کہ وہ شرعاً حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے مکلف نہیں اس لئے ان کے حقوق بھی سب سے کم ہیں چنانچہ انسان کو ان کے معاملہ میں وسیع آزادی عطا کی گئی ہے کہ وہ ان سے چند معمولی سی پابندیوں

کیساتھ جس طرح چاہے نفع اٹھاسکتا ہے، چنانچہ بعض حیوانات کو وہ کاٹ کر کھاتا ہے بعض پر سواری کرتا ہے بعض مخلوقات کو پامال کرتا ہے مگر اسے ان مخلوقات کی حق تلفی نہیں سمجھا جاتا اس لئے کہ ان مخلوقات پر چونکہ فرائض کم ہیں اس لئے اُن کے حقوق بھی بہت کم ہیں پھر کائنات میں سب سے زیادہ فرائض انسان اور جنات پر عائد کئے گئے ہیں کہ وہ اپنے ہر قول و فعل اور ہر نقل و حرکت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہیں اور اگر اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کریں تو آخرت کے عذاب کے مستحق ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان اور جنات کو حقوق بھی دوسری مخلوقات کے مقابلہ کہیں زیادہ عطا کئے ہیں۔ پھر انسانوں میں بھی یہ لحاظ ہے کہ جس کی ذمہ داری اور فرائض دوسروں سے زیادہ ہیں، اس کے حقوق بھی زائد ہیں، انسانوں میں سب سے زیادہ ذمہ داری انبیاء علیہم السلام پر ہوتی ہے، چنانچہ ان کو بہت سے حقوق بھی دوسروں سے زائد عطا کئے گئے ہیں۔

نظامِ معیشت میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی رعایت رکھی ہے کہ ہر شخص کو اتنے معاشی حقوق دیئے جائیں جتنے فرائض کی ذمہ داری وہ اپنے سر لے اور ظاہر ہے کہ فرائض میں یکسانیت کا پیدا ہونا بالکل ناممکن اور ان میں تفاوت ناگزیر ہے، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ہر شخص کے معاشی وظائف و فرائض دوسروں سے بالکل مساوی ہوں اس لئے کہ معاشی وظائف و فرائض انسانوں کی فطری صلاحیتوں پر موقوف ہیں جن میں جسمانی طاقت، صحت، دماغی قویٰ اور عمر، ذہنی معیار چستی اور پھرتی جیسی چیزیں داخل ہیں اور یہ بات ہر شخص کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہے کہ ان اوصاف کے اعتبار سے انسانوں میں یکسانیت اور مساوات پیدا کرنا بڑی سے بڑی ترقی یافتہ اشتراکی حکومت کے بس میں بھی نہیں۔ جب انسانوں کی صلاحیتوں میں تفاوت ناگزیر ہے تو ان کے فرائض میں بھی لازماً تفاوت ہوگا اور معاشی حقوق چونکہ انہی فرائض پر موقوف ہیں۔ اسلئے معاشی حقوق یعنی آمدنی میں بھی تفاوت ناگزیر ہے کیونکہ اگر سب کی آمدنی بالکل مساوی کر دی جائے اور فرائض میں تفاوت رہے تو اس سے کبھی عدل و انصاف قائم نہیں ہوسکتا اس لئے کہ اس صورت میں بعض لوگوں کی آمدنی ان کے فرائض سے زیادہ اور بعض کی ان کے فرائض سے کم ہو جائے گی جو صریح ناانصافی ہے اس سے واضح ہوگیا کہ آمدنی میں مکمل مساوات کسی بھی دور میں قرینِ انصاف نہیں ہوسکتی لہٰذا اشتراکیت اپنی ترقی کے انتہائی دور[1] (مکمل کمیونزم) میں بھی جس مساوات کا دعویٰ کرتی ہے وہ کسی بھی حال میں نہ قابلِ عمل ہے اور نہ قرینِ عدل و انصاف، البتہ یہ

---

[1] اشتراکیت کا کہنا یہ ہے کہ فی الحال تو آمدنی کی مکمل مساوات ممکن نہیں لیکن اگر اشتراکیت کے ابتدائی اصولوں پر عمل کیا جاتا رہے تو ایک وقت ایسا آجائے گا جب آمدنی مکمل مساوات یا املاک میں مکمل اشتراک پیدا ہو جائے گا اور یہ مکمل کمیونزم کا دور ہوگا۔

طے کرنا کہ کس کے فرائض زیادہ اور کس کے کم ہیں اور اُن کی مناسبت سے اسے کتنے حقوق ملنے چاہئیں ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے اور انسان کے پاس کوئی ایسا پیمانہ نہیں ہے جس سے وہ اس بات کا ٹھیک ٹھیک تعین کر سکے ۔ بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک ماہر اور تجربہ کار انجنیئر نے ایک گھنٹہ میں اتنی آمدنی حاصل کر لی ہے جو ایک غیر ہنرمند مزدور نے دن بھر منوں مٹی ڈھو کر بھی حاصل نہیں کی، لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو قطع نظر اس سے کہ مزدور کی دن بھر کی آزاد محنت ذمہ داری کے اُس بوجھ کے برابر نہیں ہو سکتی جو انجنیئر نے اُٹھا رکھا ہے انجنیئر کی یہ آمدنی صرف اس ایک گھنٹے کی محنت کا صلہ نہیں بلکہ اس میں سالہا سال کی اس دماغ سوزی، عرق ریزی اور جانفشانی کے صلے کا ایک حصہ بھی شامل ہے جو اُس نے انجنیئرنگ کی تعلیم تربیت اور پھر اس میں تجربہ و مہارت حاصل کرنے میں برداشت کی ہے ۔ اشتراکیت نے اپنے ابتدائی دور میں آمدنی کے اس تفاوت کو تسلیم تو کر لیا ہے چنانچہ تمام اشتراکی ممالک میں آبادی کے مختلف طبقات کے درمیان تنخواہوں کا زبردست تفاوت پایا جاتا ہے لیکن ٹھوکر یہاں کھائی ہے کہ تمام وسائلِ پیداوار کو حکومت کی تحویل میں دیکر وسائل کے لئے فرائض کا تعین اور پھر ان کی مناسبت سے ان پر آمدنی کی تقسیم بھی تمام تر حکومت ہی کے حوالہ کر دی ہے ، حالانکہ جیسا اوپر عرض کیا گیا فرائض اور حقوق کے درمیان تناسب باقی رکھنے کے لئے انسان کے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہے چنانچہ اشتراکیت کے طریق کار کے تحت ملک بھر کے انسانوں کی روزی کا تعین حکومت کے چند کارندوں کے ہاتھ میں آگیا ہے اور انہیں یہ اختیار مل گیا ہے کہ جس شخص کو جتنا چاہیں دیں جتنا چاہیں روک لیں ۔ اوّل تو اس میں بد دیانتیوں اور اقربا نوازیوں کو ایک بڑا میدان مل جاتا ہے جس کے سہارے افسر شاہی پھلتی پھولتی ہے ۔ دوسرے اگر حکومت کے تمام کارندوں کو فرشتہ بھی تصوّر کر لیا جائے اور وہ فی الواقعہ یہی چاہیں کہ ملک میں آمدنی کی تقسیم حق و انصاف کی بنیاد پر ہو تو ان کے پاس آخر وہ کونسا پیمانہ ہے جس سے وہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ ایک انجنیئر اور ایک مزدور کے فرائض میں کتنا تفاوت ہے اور اس کی نسبت سے ان کی آمدنیوں میں کتنا تفاوت قرینِ انصاف ہے ۔

واقعہ یہ ہے کہ اس بات کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ انسانی عقل کے ادراک سے قطعی ماورا ہے اسی لئے اسے قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے ۔ آیت زیر بحث ورفعنا بعضھم فوق بعض درجٰت میں اللہ تعالیٰ نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس تفاوت کا تعین ہم نے انسانوں کے حوالہ کرنے کے بجائے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اپنے ہاتھ میں رکھنے کا مطلب یہاں بھی یہی ہے کہ ہر شخص اپنی حاجت پوری کرنے کے لئے دوسرے کو اتنا دینے پر مجبور ہے

جتنے کا وہ مستحق ہے، یہاں بھی باہمی احتیاج پر مبنی طلب و رسد کا نظام ہر شخص کی آمدنی کا تعین کرتا ہے، یعنی ہر شخص اس بات کا فیصلہ خود کرتا ہے کہ جتنے فرائض میں نے اپنے ذمے لئے ہیں ان کا کتنا معاوضہ میرے لئے کافی ہے اس سے کم ملے تو یہ کام کرنے پر راضی نہ ہو اور یہ زیادہ مانگنے لگے تو کام لینے والا اس سے کام نہ لے لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا کا یہی مطلب ہے کہ ہم نے آمدنی میں تفاوت اس لئے رکھا ہے تاکہ ایک شخص دوسرے سے کام لے سکے ورنہ سب کی آمدنی برابر ہوتی تو کوئی کسی کے کام نہ آتا ۔

ہاں البتہ بعض غیر معمولی حالات میں بڑے بڑے سرمایہ دار طلب و رسد کے اس قدرتی نظام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر غریبوں کو اس بات پر مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے حقیقی استحقاق سے کم اُجرت پر کام کریں، اسلام نے اول تو حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے وسیع احکام کے ذریعہ نیز اخلاقی ہدایات اور تصورِ آخرت کے ذریعہ ایسی صورتِ حال کو پیدا ہونے سے روکا ہے اور اگر کبھی کسی مقام پر یہ صورت پیدا ہو جائے تو اسلامی حکومت کو یہ اختیار دیدیا ہے کہ ان غیر معمولی حالات کی حد تک وہ اُجرتوں کا تعین کر سکتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف غیر معمولی حالات کے لئے ہے اس لئے اس مقصد کے لئے تمام وسائلِ پیداوار کو حکومت کے حوالہ کر دینے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے نقصانات فوائد سے کہیں زیادہ ہیں ۔

اسلامی مساوات کا مطلب

مذکورہ بالا اشارات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آمدنی میں مکمل مساوات نہ عدل و انصاف کا تقاضا ہے، نہ عملاً کہیں قائم ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے اور نہ یہ اسلام کو مطلوب ہے، البتہ اسلام نے جس مساوات کو قائم کیا ہے وہ قانون، معاشرت اور ادائے حقوق کی مساوات ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا قدرتی طریق کار کے تحت جس شخص کے جتنے حقوق متعین ہو جائیں انہیں حاصل کرنے کے قانونی، تمدنی اور معاشرتی حق میں سب برابر ہیں اس بات کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ ایک امیر یا صاحب جاہ و منصب انسان اپنا حق عزت کیساتھ بآسانی حاصل کر لے اور غریب کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں اور ذلیل و حقیر ہونا پڑے - قانون امیر کے حقوق کی حفاظت کرے اور غریب کو بے یار و مددگار چھوڑ دے ۔

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی
ترجمہ، محمد عبداللہ میمن

واشنگٹن سے

ایک سوالنامہ

(دوسری قسط)

اسلامی مرکز "واشنگٹن" کی طرف سے ۲۸ سوالات پر مشتمل ایک تفصیلی سوال نامہ "اسلامی فقہ اکیڈمی" جدہ کو موصول ہوا تھا۔ جو ایسے مسائل پر مشتمل تھا جن کے بارے میں یورپ اور امریکہ میں رہائش پذیر مسلمان تسلی بخش جواب کے طالب رہتے ہیں "اکیڈمی" نے وہ سوالنامہ تحقیقی جواب کے لئے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی خدمت میں ارسال کر دیا۔ مولانا موصوف نے ان کا تفصیلی اور تحقیقی جواب عربی میں تحریر فرمایا۔ جس کا اردو ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ (ادارہ)

سوال نمبر (۳)

مسلمان عورت کا غیر مسلم مرد سے نکاح

کسی مسلمان عورت کا کسی غیر مسلم مرد سے نکاح کرنا کیسا ہے؟ اگر اس عورت کو یہ امید ہو کہ اس شادی کے نتیجے میں وہ مرد مسلمان ہو جائے گا تو کیا اس شخص کے مسلمان ہو جانے کی امید اور لالچ میں اس سے نکاح کرنا درست ہے؟ جبکہ دوسری طرف اس

مسلمان عورت کو مسلمانوں میں کوئی برابری کا رشتہ نہ مل رہا ہو اور معاشی تنگی کی وجہ سے خود عورت کے دین سے منحرف ہونے کا امکان بھی ہو تو کیا ایسی صورت میں نکاح کے جواز میں کچھ گنجائش نکل سکتی ہے؟

سوال نمبر ۴

اگر کوئی عورت مسلمان ہوجائے اور اس کا شوہر کافر ہو، تو کیا اس عورت کو اپنے شوہر سے علاقہ زوجیت برقرار رکھنے کی گنجائش ہے جبکہ اس عورت کو یہ امید ہے کہ علاقۂ زوجیت باقی رکھنے کی صورت میں وہ اپنے شوہر کو اسلام کی دعوت دیکر مسلمان کر لیگی جب کہ دوسری طرف اس عورت کی اپنے شوہر سے اولاد بھی ہے اور علاقہ زوجیت ختم کرنے کی صورت میں ان کے ضائع ہوجانے اور دین سے منحرف ہوجانے کا قوی احتمال موجود ہے کیا ان حالات میں اس عورت کے لئے اپنے شوہر سے رشتہ زوجیت برقرار رکھنے کی کچھ گنجائش ہے؟

اور اگر اس عورت کو اپنے شوہر کے اسلام لانے کی امید تو نہیں ہے۔ لیکن اس کا شوہر اس کے ساتھ اچھے اخلاق اور بہترین معاشرت کے ساتھ حق زوجیت ادا کر رہا ہے اور اس عورت کو یہ بھی ڈر ہے کہ اگر اس نے اپنے شوہر سے جدائی اختیار کر لی تو کوئی مسلمان مرد اس سے شادی کرنے پر تیار نہیں ہوگا۔ کیا اس صورت میں مسئلہ کے جواز و عدم جواز پر کوئی فرق واقع ہوگا؟

الجواب۔ ۳ و ۴

کسی مسلمان عورت کے لئے کسی غیر مسلم مرد سے نکاح کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں قرآن کریم کا واضح ارشاد موجود ہے:

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا،
وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ
وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ۔

اور مشرکین سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور البتہ مسلمان غلام بہتر ہے مشرک سے، اگرچہ وہ تم کو بھلا لگے۔ (بقرہ: ۲۲۱)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ

نہ وہ عورتیں ان کافروں کے لئے حلال ہیں اور نہ وہ کافر ان عورتوں کے لئے حلال ہیں۔ (الممتحنۃ: ۱۰)

اور کسی کافر کے مسلمان ہوجانے کی صرف امید اور لالچ کسی مسلمان عورت کے لئے اس سے نکاح کرنے کی وجہ جواز نہیں بن سکتی ہے اور نہ ہی اس قسم کی خیالی اُمید اور لالچ کسی حرام کام کو حلال کر سکتی ہے۔

اسی طرح اگر کوئی عورت مسلمان ہوجائے تو جمہور علماء کے نزدیک اس کے صرف اسلام لانے سے بھی نکاح ختم ہو جائے گا۔ البتہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف اسلام لانے سے نکاح نہیں ٹوٹے گا۔ بلکہ عورت کے اسلام لانے کے بعد مرد کو اسلام کی دعوت دی جائے گی۔ اگر وہ بھی اسلام قبول کرلے تب تو نکاح باقی رہے گا اور اگر اسلام لانے سے انکار کردے تو نکاح ٹوٹ جائے گا۔

اور اگر شوہر بعد میں مسلمان ہو جائے تو یہ دیکھا جائے گا کہ اس عورت کی عدت گذر چکی ہے یا نہیں؟ اگر وہ عورت ابھی عدت میں ہے تو شوہر کے اسلام لانے سے پہلا نکاح دوبارہ لوٹ آئے گا اور اگر اس کی عدت گذر چکی تھی تو اس صورت میں دونوں کے درمیان نکاح جدید کرنا ضروری ہوگا۔ نکاح کے بعد وہ دونوں بحیثیت میاں بیوی کے رہ سکتے ہیں۔ اس مسئلہ میں تمام فقہاء متفق ہیں۔ لہٰذا شوہر کے اسلام لانے کی موہوم امید اور لالچ کی بنیاد پر شریعت کا قطعی حکم نہیں بدلا جا سکتا۔

سوال نمبر ⑤

مسلمان میت کو غیر مسلموں کے قبرستان میں دفن کرنا

امریکہ اور یورپ کے تمام ممالک میں مسلمانوں کے لئے کوئی ایسا مخصوص قبرستان نہیں ہوتا۔ جس میں وہ اپنے مردوں کو دفن کر سکیں، اور جو عام قبرستان ہوتے ہیں ان میں عیسائی اور یہودی وغیرہ سب اپنے مردوں کو دفن کرتے ہیں اور مسلمانوں کو ان قبرستان سے باہر کسی دوسری جگہ دفن کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان حالات میں کیا مسلمان اپنے مردوں کو غیر مسلموں کے ساتھ ان کے قبرستان میں دفن کر سکتے ہیں؟

الجواب ۵ : عام حالات میں تو مسلمان میت کو غیر مسلموں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں، البتہ ان مخصوص حالات میں جو سوال میں مذکور ہیں کہ مسلمانوں کے لئے نہ تو مخصوص قبرستان ہے اور نہ ہی قبرستان سے باہر کسی اور جگہ دفن کرنے کی اجازت ہے۔ ان حالات میں ضرورت کے پیش نظر مسلمان میت کو غیر مسلموں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز ہے۔

سوال نمبر ⑥ مسجد کو بیچنے کا حکم: اگر امریکہ اور یورپ کے کسی علاقے کے مسلمان اپنے علاقے کو چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے میں منتقل ہو جائیں اور پہلے علاقے میں جو مسجد ہو، اس کے ویران ہو جانے یا اس پر غیر مسلموں کا تسلط اور قبضہ ہو جانے کا خطرہ ہو تو کیا اس صورت میں اس مسجد کو بیچنا جائز ہے؟ اس لئے کہ عام طور پر مسلمان مسجد کے لئے کوئی مکان خرید کر اس کو مسجد بنا لیتے ہیں اور پھر حالات کے پیش نظر اکثر مسلمان جب اس علاقے کو چھوڑ کر دوسرے علاقے میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور مسجد کو یونہی مہمل اور بیکار چھوڑ دیتے ہیں تو دوسرے غیر مسلم اس مسجد پر قبضہ کر کے اس کو اپنے تصرف میں لے آتے ہیں جبکہ یہ ممکن ہے کہ اس مسجد کو بیچ کر دوسرے علاقے میں جہاں مسلمان آباد ہوں اسی رقم سے کوئی مکان خرید کر مسجد بنائی جائے اس طرح مسجد بیچ کر دوسری مسجد میں تبدیل کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب ۶: مغربی ممالک میں جن جگہوں پر مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔ وہ دو قسم کی ہوتی ہیں۔

۱۔ بعض جگہیں تو ایسی ہوتی ہیں جن کو مسلمان نماز پڑھنے اور دینی اجتماعات کے لئے مخصوص کر دیتے ہیں۔ لیکن ان جگہوں کو شرعی طور پر دوسری مساجد کی طرح وقف کر کے شرعی مسجد نہیں بناتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان جگہوں کا نام بھی مسجد کی بجائے دوسرے نام مثلاً "اسلامی مرکز" یا "دار الصلاۃ" یا "دار الجماعت" رکھ دیتے ہیں۔

اس قسم کے مکانات کا معاملہ تو بہت آسان ہے، اس لئے کہ ان مکانات کو اگرچہ نماز کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن جب ان کے مالکوں نے ان کو مسجد نہیں بنایا اور نہ ان کو وقف کیا ہے تو وہ شرعاً مسجد ہی نہیں۔ لہٰذا ان مکانات کے مالک مسلمانوں کے مصالح کے پیش نظر ان کو بیچنا چاہیں تو شرعاً بالکل اجازت ہے۔ اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔

۲۔ دوسرے بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جن کو مسلمان عام مساجد کی طرح وقف کر کے شرعی مسجد بنا لیتے ہیں۔ جمہور فقہاء کے نزدیک اس قسم کی جگہوں کا حکم یہ ہے کہ وہ مکان اب قیامت تک کے لئے مسجد بن گیا۔ اس کو کسی صورت میں بھی بیچنا جائز نہیں اور نہ وہ مکان اب وقف کرنے والے کی ملکیت میں داخل ہو سکتا ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے۔

چنانچہ مسلک شافعی کے امام خطیب شربینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ولو انهدم مسجد، وتعذرت إعادته، أو تعطل بخراب البلد مثلاً، لم يعد ملكاً ولم يبع بحال، كالعبد إذا عتق، ثم زمن، ولم ينقض إن لم يخف عليه لإمكان الصلاة فيه، ولإمكان عوده كما كان ..... فإن خيف عليه نقض، وبنى الحاكم بنقضه مسجداً آخر إن رأى ذلك، والا حفظه، وبناؤه بقربه أولى، ولا يبنى به بئراً".

"اگر مسجد منہدم ہو جائے، اور اس کو دوبارہ درست کرنا ممکن نہ ہو، یا اس بستی کے اجڑ جانے سے وہ مسجد بھی ویران ہو جائے تب بھی وہ مسجد مالک کی ملکیت میں نہیں آئے گی اور نہ اس کو بیچنا جائز ہوگا۔ جیسا کہ غلام کو آزاد کر دینے کے بعد اس کی بیع حرام ہو جاتی ہے پھر اگر اس مسجد پر غیر مسلموں کے قبضے کا خوف نہ ہو تو اس کو منہدم نہ کیا جائے، بلکہ اس کی اپنی حالت پہ برقرار رکھا جائے، اس لئے کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ مسلمان دوبارہ یہاں آکر آباد ہو جائیں، اور اس مسجد کو دوبارہ زندہ کر دیں ..... البتہ اگر غیر مسلموں کے تسلط اور قبضہ کا خوف ہو تو اس صورت میں حاکم وقت مناسب سمجھے تو اس مسجد کو ختم کر دے اور اس کے بدلے میں دوسری جگہ مسجد بنا دے، اور یہ دوسری مسجد پہلی مسجد کے قریب ہونا زیادہ بہتر ہے اور اگر حاکم وقت اس مسجد کو توڑنا اور مسمار کرنا مناسب نہ سمجھے تو پھر اس کی حفاظت کرے۔ (مغنی المحتاج: ص ۳۹۲ ج ۲)

اور فقہاء مالکیہ میں سے علامہ مواق رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"ابن عرفة من المدونة وغيرها، يمنع بيع ما خرب من ربع الحبس مطلقاً ..... وعبارة الرسالة: ولا يباع الحبس وإن خرب ..... وفي الطرر عن ابن عبد الغفور: لا يجوز بيع مواضع المساجد الخربة، لأنها وقف، ولا بأس ببيع نقضها".

ابن عرفہ مدونہ وغیرہ سے نقل کرتے ہیں کہ وقف مکان کی بیع مطلقاً جائز نہیں، اگرچہ وہ ویران ہو جائے ..... اور رسالہ

میں یہ عبارت درج ہے کہ : وقف کی بیع جائز نہیں اگر چہ وہ ویران ہو جائے ... طرمیں ابن عبد الغفور سے یہ عبارت منقول ہے کہ : ویران مساجد کی جگہوں کو بیچنا وقف ہونے کی بنا پر جائز نہیں۔ البتہ ان کا ملبہ بیچنا جائز ہے۔"

(التاج والاکلیل للمواق، حاشیہ حطاب، ص ۴۲ ج ۶)

اور فقہ حنفی کی مشہور و معروف کتاب ھدایہ میں ہے :

"ومن اتخذ أرضه مسجداً لم يكن له أن يرجع فيه، ولا يبيعه، ولا يورث عنه، لأنه تجرد عن حق العباد، وصار خالصاً لله، وهذا لأن الأشيا كلها لله تعالى، وانا أسقط العبد ماثبت له من الحق رجع الى أصله، فانقطع تصرفه عنه، كما في الاعتاق، ولو خرب ماحول المسجد - واستغنى عنه يبقى مسجداً عند أبي يوسف، لأنه اسقاط منه، فلا يعود إلى ملكه"

اگر کسی شخص نے اپنی زمین مسجد کے لئے وقف کر دی تو اب وہ شخص نہ تو اس وقف سے رجوع کر سکتا ہے اور نہ اس کو بیچ سکتا ہے اور نہ اس میں وراثت جاری ہوگی اس لئے کہ وہ جگہ بندہ کی ملکیت سے نکل کر خالص اللہ کے لئے ہوگی وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر چیز حقیقتاً اللہ کی ملکیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے بندہ کو تصرف کا حق عطا فرمایا ہے۔ جب بندہ نے اپنا حق تصرف ساقط کر دیا تو وہ چیز ملکیت اصلی یعنی اللہ کی ملکیت میں داخل ہو جائے گی لہٰذا اب بندہ کا اس میں تصرف کرنے کا حق ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ آزاد کردہ غلام میں (بندہ کا حق تصرف ختم ہو جاتا ہے۔)

اور اگر مسجد کے اطراف کا علاقہ ویران ہو جائے اور مسجد کی ضرورت باقی نہ رہے تب بھی امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسجد ہی رہے گی۔ اس لئے کہ اس کو مسجد بنانا اپنا حق ساقط کرنا ہے۔ لہٰذا بندہ کا اپنا حق ساقط کرنے کے بعد دوبارہ وہ حق اس کی ملکیت میں واپس نہیں آئے گا۔

(ھدایہ مع فتح القدیر ص ۴۳۶ ج ۵)

البتہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک ہے کہ اگر مسجد کے اطراف کی آبادی ختم ہو جائے اور

مسجد کی ضرورت بالکلیہ ختم ہو جائے تو اس صورت میں مسجد کو بیچنا جائز ہے، چنانچہ المغنی لابن قدامہ میں یہ عبارت منقول ہے:

إن الوقف إذا خرب، وتعطلت منافعه، كدار انهدمت، أو أرض خربت، وعادت مواتاً، ولم تكن عمارتها، أو مسجد انتقل أهل القرية عنه، وصار في موضع لا يصلى فيه، أو ضاق بأهله، ولم يمكن توسيعه في موضعه، أو تشعب جميعه، فلم تمكن عمارته، ولا عمارة بعضه إلا ببيع بعضه، جاز بيع بعضه لتعمر به بقيته، وإن لم يمكن الانتفاع بشيء منه بيع جميعه۔

اگر وقف کی زمین ویران ہو جائے اور اس کے منافع ختم ہو جائیں۔ مثلاً کوئی مکان تھا وہ منہدم ہو گیا، یا کوئی زمین تھی جو ویران ہو کر ارض موات بن جائے۔ یا کسی مسجد کے اطراف میں جو آبادی تھی وہ کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائے اور اب اس مسجد میں کوئی نماز پڑھنے والا بھی نہ رہے، یا وہ مسجد آبادی کی کثرت کی وجہ سے نمازیوں سے تنگ ہو جائے اور مسجد میں توسیع کی بھی گنجائش نہ ہو۔ یا اس مسجد کے اطراف میں رہنے والے لوگ منتشر ہو جائیں اور جو لوگ وہاں آباد ہوں وہ اتنی قلیل تعداد میں ہوں کہ ان کے لئے اس مسجد کی تعمیر اور درست کرنا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں اس مسجد کے کچھ حصے کو فروخت کر کے اس کی رقم سے دوسرے حصے کی تعمیر کرنا جائز ہے اور اگر مسجد کے کسی بھی حصے سے انتفاع کا کوئی راستہ نہ ہو تو اس صورت میں پوری مسجد کو بیچنا بھی جائز ہے۔

(المغنی لابن قدامہ مع الشرح الکبیر ص ۲۲۵ ج ۶)

امام احمدؒ کے علاوہ امام محمد بن حسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ بھی جواز بیع کے قائل ہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ اگر وقف زمین کی ضرورت بالکلیہ ختم ہو جائے تو زمین دوبارہ واقف کی ملکیت میں داخل ہو جائے گی۔ اور اگر واقف کا انتقال ہو چکا ہو تو پھر اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے گی چنانچہ صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

"وعند محمدؒ یعود الی ملک البانی، او الی

وارثہ بعد موتہ، لأنہ عینہ لنوع قربۃ، وقد انقطعت، فصار کحصید المسجد وحشیشہ اذا استغنی عنہ،

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ زمین دوبارہ مالک کی ملکیت میں چلی جائے گی اور اگر اس کا انتقال ہوچکا ہے تو اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہوجائے گی، اس لئے کہ اس کے مالک نے اس زمین کو ایک مخصوص عبادت کے لئے معین کر دیا تھا اب جب کہ اس جگہ پر وہ مخصوص عبادت کی ادائیگی منقطع ہوگئی تو پھر اس کی ضرورت باقی نہ رہنے کی وجہ سے وہ مالک کی ملکیت میں داخل ہوجائے گی۔ جیسے کہ مسجد کی دری، چٹائی یا گھاس وغیرہ کی ضرورت ختم ہونے کے بعد وہ مالک کی ملکیت میں واپس لوٹ آتی ہے۔

(ھدایہ مع فتح القدیر: ص ۴۴۶ ج ۵)

لہٰذا جب وہ مالک کی ملکیت میں واپس آگئی تو اس کے لئے اس کا بیچنا بھی جائز ہوگا۔

جمہور فقہاء نے وقف مسجد کی زمین کی بیع ناجائز ہونے اور مالک کی ملکیت میں دوبارہ نہ لوٹنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقف کے واقعہ سے استدلال کیا ہے وہ یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خیبر کی زمین وقف کی تو وقف نامہ میں یہ شرائط درج کیں کہ:

"أنہ لایباع أصلھا، ولا تبتاع، ولا تورث ولا توھب"

آئندہ وہ زمین نہ تو بیچی جائے گی، نہ اس میں وراثت جاری ہوگی، اور نہ کسی کو ھبہ کی جاسکے گی۔"

یہ واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے البتہ مندرجہ بالا الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے جمہور کی طرف سے بیت اللہ کو دلیل میں پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: فترۃ (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کا عرصہ) کے زمانے میں بیت اللہ کے اندر اور اس کے اطراف میں بت ہی بت تھے اور بیت اللہ کے اطراف میں ان کفار اور مشرکین کا صرف شور مچانے چیخنے اور سیٹیاں بجانے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا اس کے باوجود بیت اللہ مقام قربت

اور مقام طاعت و عبادت ہونے سے خارج نہیں ہوا۔ لہٰذا یہی حکم تمام مساجد کا ہوگا۔ (کہ اگر کسی مسجد کے قریب ایک مسلمان بھی باقی نہ رہے۔ جو اس میں عبادت کرے تب بھی وہ مسجد محل عبادت ہونے سے خارج نہیں ہوگی۔)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے مندرجہ بالا استدلال پر علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ فترۃ کے زمانے میں بیت اللہ کا طواف تو کفار و مشرکین بھی کرتے تھے۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ اس زمانے میں عبادت مقصودہ بالکلیہ ختم ہوگئی تھیں۔

اس اعتراض کے جواب میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ علیہ فرماتے ہیں کہ بیت اللہ کے قیام کا مقصد صرف اس کا طواف کرنا نہیں ہے بلکہ بیت اللہ کے قیام کا بڑا مقصد اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا ہے یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کے جوار میں اپنی اولاد کے قیام کا ذکر فرمایا تو اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ:

" رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ "

اے میرے رب! (میں نے ان کو یہاں اس لئے ٹھہرایا ہے) تاکہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں"

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نماز کا تو ذکر فرمایا۔ طواف کا ذکر نہیں فرمایا۔ اس کے علاوہ خود اللہ جل شانہٗ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیتے ہوئے فرمایا:

" طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ "

میرے گھر کو مسافروں اور مقیمین کے لئے پاک کردو"

یہ استدلال اس وقت ہے جب "طائفین" اور "عاکفین" کی تفسیر مسافر اور مقیم سے کی جائے، جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیت: "سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادُ" میں لفظ "عاکف" مقیم کے معنیٰ ہی میں استعمال ہوا ہے۔

(اعلاء السنن ص ۲۱۲ ج ۱۳)

اس کے علاوہ جمہور کی سب سے مضبوط دلیل قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے:

وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا

اور تمام مسجدیں اللہ کا حق ہیں، سو اللہ کے ساتھ کسی کی عبادت مت کرو

(سورۃ جن: ۱۸)

چنانچہ اس آیت کے تحت علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ احکام القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

"إذا تعينت لله أصلاً وعيّنت له عقد أفصارت

عتیقة عن التملك، مشترکة بين الخليقة في العبادة "
کہ جب وہ مسجدیں خالص اللہ کے لئے ہوگئیں، تو بندہ
کی ملکیت سے آزاد ہوگئیں، اور صرف عبادت ادا کرنے کی حد
تک تمام مخلوق کے درمیان مشترکہ ہوگئیں۔
(احکام القرآن لابن عربی ص ۱۸۶۹ ج ۴)
اور علامہ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ حضرت عکرمہ کا قول نقل کرتے ہیں:
وأن المساجد لله، قال: المساجد كلها "
بے شک مسجدیں اللہ کے لئے ہیں، حضرت عکرمہ فرماتے ہیں:
کہ تمام مسجدیں اس میں داخل ہیں۔ کسی کی تفریق نہیں ہے۔
(تفسیر ابن جریر: ص ۳۷۔ پارہ ۲۹)
علامہ ابن قدامہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی تائید میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ مکتوب پیش کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا کہ کوفہ کے بیت المال میں چوری ہوگئی اور اس کی اطلاع حضرت عمرؓ کو ہوئی تو آپ نے لکھا کہ موضع تمارین کی مسجد منتقل کرکے بیت المال کے قریب اس طرح بناؤ کہ بیت المال مسجد کے قبلہ کی سمت میں ہو جائے۔ اس لئے کہ مسجد میں ہر وقت کوئی نہ کوئی نمازی موجود ہی ہوتا ہے۔ (اس طرح بیت المال کی بھی حفاظت ہو جائے گی۔)
(المغنی لابن قدامہ، ۶ : ۲۲۶)
اس استدلال کا جواب دیتے ہوئے علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:
ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد مسجد کو منتقل کرنا نہ ہو۔ بلکہ بیت المال کو منتقل کرکے مسجد کے سامنے بنانے کا حکم دیا ہو۔
(فتح القدیر، ج ۵۔ ص ۴۴۶)
بہر حال! مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس سلسلے میں جمہور کا مسلک راجح ہے۔ لہٰذا کسی مسجد کے شرعی مسجد بن جانے کے بعد اس کو بیچنا جائز نہیں اگر مسجد کو بیچنے کی اجازت دے دی جائے تو پھر لوگ مسجدوں کو بھی گرجا گھر کی طرح جب چاہیں گے بیچ دیں گے اور مسجدیں ایک تجارتی سامان کی حیثیت اختیار کرلیں گی۔
لیکن فقہاء کے مندرجہ بالا اختلاف کی وجہ سے چونکہ یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے اور دونوں طرف قرآن و سنت کے دلائل موجود ہیں! لہٰذا اگر کسی غیر مسلم ملک میں مسجد کے اطراف سے تمام مسلمان ہجرت کرکے جاچکے ہوں اور اس مسجد پر کفار کے قبضہ اور تسلط کے بعد اس کے ساتھ بے حرمتی کا معاملہ کرنے کا اندیشہ ہو اور مسلمانوں کے دوبارہ

وہاں اگر آباد ہونے کا کوئی امکان نہ ہو تو اس ضرورت شدیدہ کے وقت امام احمد اور امام محمد بن حسن رحمہما اللہ کے مسلک کو اختیار کرتے ہوئے اس مسجد کو بیچنے اور اس کی قیمت سے کسی دوسری جگہ مسجد بنانے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اس کو مسجد کے سوا کسی اور مصرف میں خرچ کرنا جائز نہیں۔

جبکہ ایک اور مسئلے کے سلسلے میں علامہ ابن قدامہؒ کے اس جملے سے معلوم ہوتا ہے:

ویجعل بدلہ مسجدا فی موضع آخر۔

اور اس کے بدلے کسی دوسری جگہ کوئی مسجد بنادی جائے۔

(المغنی لابن قدامہ ص ۲۲۸ ج ۶)

بہرحال! امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے جہاں مسجد کی بیع کی اجازت دی گئی ہے وہ اس وقت ہے جب تمام مسلمان اس مسجد کے پاس سے دوسری جگہ منتقل ہو جائیں اور دوبارہ ان کے واپس آنے کا بھی کوئی امکان نہ ہو۔ لیکن اگر تمام مسلمان تو وہاں سے منتقل نہ ہوئے ہوں بلکہ مسلمانوں کی اکثریت وہاں سے دوسری جگہ منتقل ہو گئی ہو۔ لیکن بعض مسلمان اب بھی وہاں رہائش پذیر ہوں اس صورت میں اس مسجد کی بیع کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ حتیٰ کہ فقہا حنابلہ بھی عدم جواز کے قائل ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔

"وان لم تتعطل مصلحۃ الوقف بالکلیۃ، لکن قلت، وکان غیرہ انفع منہ، وأکثر ردا علی أھل الوقف لم یجز بیعہ، لأن الأصل تحریم البیع، وانما أبیح للضرورۃ صیانۃ لمقصود الوقف عن الضیاع مع امکان تحصیلہ ومع الانتفاع وان قل ما یضیع المقصود"۔

اگر وقف کی مصلحت اور منفعت بالکلیہ ختم نہ ہوئی ہو، لیکن اس میں کمی آگئی ہو، اور دوسری صورت اہل وقف کے لئے زیادہ نفع بخش اور بہتر ہے، تب بھی اس وقف کی بیع جائز

نہیں، اس لئے کہ وقف میں اصل بیع کی حرمت ہی ہے۔ لیکن وقف کی مصلحت کے لئے اور اس کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے ضرورت کے تحت بیع اس وقت جائز ہے جبکہ بیع کا مقصد بھی تحصیل مقصود ہو۔ لیکن اگر موجودہ حالت میں، وقف کی بیع کے بغیر ہی اس سے نفع اٹھانا ممکن ہو اگرچہ وہ نفع قلیل مقدار میں ہو، تو اس صورت میں مقصود وقف بالکلیہ ختم نہ ہونے کی وجہ سے اس وقف کی بیع جائز نہیں ہوگی۔"

(المغنی لابن قدامہ ص ۲۲۷ ج ۶)

واللہ اعلم بالصواب

(جاری ہے)

جناب مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب

صدر دار العلوم کراچی

تغیر پذیر حالات میں

اجتماعی اجتہاد کی ضرورت

چند ماہ قبل دسمبر ۱۹۸۹ء میں "اسلامی فقہ اکیڈمی ھند" کی طرف سے دوسرا فقہی عالمی سیمینار دہلی میں منعقد ہوا جس میں ہندوستان بھر کے چیدہ چیدہ اربابِ فتویٰ، متبحر علماء کرام اور بعض عرب ممالک کے فاضل مندوبین شریک ہوئے، نیز معاشیات، طب، اور سیاسیات و مالیات کے ماہرین نے بھی بھرپور حصّہ لیا۔ اکیڈمی کی دعوت پر دار العلوم کراچی کے صدر حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب بھی دہلی تشریف لے گئے، اور اس ۴ روزہ سیمینار کا افتتاحی اجلاس آپ ہی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس سے آپ نے جو خطاب فرمایا اُسے ٹیپ کر لیا گیا تھا۔ حال ہی میں ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ نے اسے اپنے مندرجۂ ذیل نوٹ کے ساتھ مارچ، اپریل ۱۹۹۰ء کے شمارے میں شائع کیا ہے:-

> دوسرے فقہی سیمینار منعقدہ ہمدرد نگر دہلی کے افتتاحی اجلاس میں جناب مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی زید مجدھم مہتمم دار العلوم کراچی پاکستان نے بڑا پُر مغز اور فکر انگیز خطاب فرمایا، اس خطاب میں تیزی سے بدلتے ہوئے نت نئے حالات اور جدید فقہی مسائل کے بارے میں اجتماعی اجتہاد پر زور دیا گیا ہے، اور اس سلسلے میں قیمتی مشورے پیش کئے گئے ہیں، اس میدان میں پاکستان میں جو کام ہوئے ان کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی دامت برکاتہم (جو خود متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور فقہ و افتاء کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں) کا یہ خطاب علماء اور اصحاب افتاء کے لئے سرمۂ بصیرت ہے خطاب کا متن قارئین "الفرقان" کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ———— مدیر

ہم بھی اس گرانقدر خطاب کو "الفرقان" لکھنؤ کے شکریہ کے ساتھ 'البلاغ' کے محترم قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ 'البلاغ' میں اشاعت کے وقت حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے اس پر نظرثانی اور تصحیح بھی فرمائی ہے۔ ——— ادارہ

جدید فقہی مسائل پر اجتماعی غور و خوض کی ضرورت:

خطبۂ مسنونہ کے بعد!

اس اجتماع کا جو سب سے بڑا فائدہ ہے وہ یہ ہے کہ یہاں قدیم اور جدید علوم کے ماہرین کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس زمانہ میں سیاسی، تمدنی، اقتصادی، طبی وغیرہ مسائل لتنے پھیل گئے اور اتنے گوناگوں ہو گئے ہیں کہ ان کے متعلق قرآن و سنّت کی روشنی میں احکام شرعیہ کو مرتب اور مستنبط کرنا صرف اسی شخص کے بس کا کام ہو سکتا تھا، جو مجتہد مطلق کہلانے کا اہل ہوتا لیکن مجتہد مطلق کا جو مقام ہے جو شرائط ہیں آپ حضرات جانتے ہیں ان کے پیش نظر آج دور دور تک کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو اجتہاد مطلق کا دعویٰ کر سکے، لیکن حالات سیاسی میدان میں، اقتصادی میدان میں، معاشرتی میدان میں اور مختلف شعبہائے حیات میں اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں، اور اتنے بڑے پیمانے پر ان میں تبدیلی رونما ہو رہی ہے کہ نت نئے فقہی مسائل پیدا ہو رہے ہیں جن میں اُمّت کی رہنمائی کا فریضہ بہرحال علماء اُمّت ہی پر عائد ہوتا ہے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ قرآن کو جو کچھ بیان کرنا تھا وہ بیان کر چکا، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی بعثت کے بعد تیئس سالہ زندگی میں قرآن کریم کی جو تشریح فرمانی تھی وہ فرما دی، اسلافِ اُمّت نے ان دونوں چیزوں کی حفاظت کی، نظم قرآن کی بھی اور معانیٔ قرآن کی بھی، ہمارا دعویٰ اور عقیدہ ہے کہ اب کوئی نئی شریعت آنے والی نہیں ہے، کسی اور نبی کے آنے کا امکان نہیں ہے، اللہ نے اپنے دین کی تکمیل کر دی اور اللہ نے ہمیں ایسی اُمّت بنایا جو آخری اُمّت ہے اور قیامت تک تمام مسائل کا سامنا اسی اُمّت کو کرنا ہے، ان حالات میں جب کہ تبدیلیاں تو معاشرہ میں اتنی تیزی سے آرہی ہیں اتنے بڑے پیمانے پر آرہی ہیں کہ ہمارا فقہی ذخیرہ جس میں بلاشبہ ان تمام چیزوں کا حل اصولی طور پر ضرور موجود ہے مگر جزوی طور پر اور جزئیات کی صورت میں وہ پوری طرح کفالت نہیں کر رہا ہے۔

علماء اُمّت کی ذمّہ داری: زندگی رواں دواں ہے، زندگی کا یہ قافلہ کسی کا انتظار

نہیں کرتا یہ مسائل جو روز بروز پیدا ہو رہے ہیں ان کے بارے میں امتِ مسلمہ کی نظریں علماء امت ہی کی طرف اٹھ رہی ہیں، اقتصادی میدان میں آپ کیا کہتے ہیں؟ طبی مسائل جو پیدا ہو رہے ہیں ان میں آپ کی رہنمائی کیا ہے؟ معاشرت اور سیاست کے میدان میں جو نت نئے نظریات، مسائل اور رسوم جڑیں پکڑ رہے ہیں ان میں اسلام کی ہدایت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں نظریں علماء کرام ہی کی طرف اٹھ رہی ہیں، اور اس کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی اس مسئولیت کو پورا کرنے کے لئے وہ جدّوجہد اختیار کریں جو ہمارے اسلاف کا وطیرہ رہی ہے، کیونکہ ابھی مغرب سے پہلے امام محمد رحمہ اللہ کا قول آپ سن چکے ہیں کہ "اگر محمد بھی سوگیا تو یہ پوچھنے والے کس سے پوچھیں گے" جو ذمہ داری اُس وقت ائمہ مجتہدین پر اور ایک ایک امام پر آرہی تھی اب جب کوئی شخص ان کی جگہ لینے والا نہیں ہے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ وہ ذمہ داری جو امام محمدؒ کے کندھوں پر تھی آج وہ ہم میں سے کسی ایک کے کندھے پر تو نہیں، لیکن ہمارے مجموعہ کے اوپر یہ ذمہ داری موجود ہے جس کا تقاضا ہے کہ تحقیق مسائل کیلئے راتوں کو جاگا کریں "مَنْ طَلَبَ الْعُلٰی سَہِرَ اللَّیَالِیْ" (پ) مجھے والد محترم کا بیان کردہ ایک واقعہ یاد آرہا ہے وہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ سے روایت کرتے تھے، علامہ عثمانیؒ فرماتے تھے کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ جب مرض الموت میں تھے، ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ کسی وقت بھی وفات کی خبر آجائے گی، ایک رات تہجد کے وقت دیوبند میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ علامہ کشمیریؒ کی وفات ہوگئی ہے، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ میں اس وقت بیتاب ہوکر جلد محلہ خانقاہ کی طرف حضرت کو دیکھنے کیلئے چلا، حضرتؒ کے کمرہ پر پہنچا تو دیکھا کہ لالٹین جل رہی ہے۔ اس زمانہ میں بجلی نہیں تھی۔ اجازت لیکر حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت شاہ صاحب دوزانو بیٹھے ہیں، کتاب "شامی" ہاتھ میں لئے لالٹین پر جھکے ہوئے 'شامی' کے مطالعہ میں غرق ہیں، بہت سخت علالت اور ضعف کا زمانہ تھا، حضرت علامہ شبیر احمدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بطور شکایت عرض کیا کہ :۔

> "حضرت ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ کہ شامی میں کونسا ایسا مسئلہ ہے جس کو آپ نے پہلے سے نہ دیکھا ہو، اور جو آپ کا دیکھا ہوا ہوتا ہے وہ آپ کو یاد بھی ہوتا ہے اور اگر کوئی مسئلہ ایسا تھا کہ جو آپ نے دیکھا نہیں تھا اور آپ کو یاد بھی نہیں تھا۔ تو ہم آپ کے غلام کہاں مرگئے تھے، ہم میں سے کسی کو حکم دیتے وہ مسئلہ نکال کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا، اس تکلیف میں آپ اتنی مشقت اُٹھا رہے ہیں!

علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ مجھے دیکھنے لگے اور فرمایا کہ "بھئی! یہ بھی ایک بیماری ہے"

توحضرات! اگر تحقیق و جستجو اور مطالعہ کی عادت ایک بیماری ہے تو اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ یہ بیماری ہم سب کو لگا دے، سچی بات یہ ہے کہ ہماری یہ بیماری چھوٹ گئی اور ہم صحت یاب ہوگئے یہ سارا زوال اسی کی نحوست سے ہے، یہ بیماری ہمارے بزرگوں کو تھی راتوں کو جاگ کر انھوں نے امتِ مسلمہ کی رہنمائی کی ہے، دوستو اور بزرگو! بہت بھاری ذمہ داری ہم پر ہے۔

جزوی مسائل میں جزوی اجتہاد:

اَب وقت نہیں رہا کہ صدیوں سال پہلے ہمارے اسلاف نے بہت عرق ریزی کے ساتھ جو کتابیں اور فتاویٰ مرتب کئے تھے محض اُن کو دیکھ کر اور گرد و پیش سے آنکھ بند کر کے فتویٰ دیتے چلے جائیں ــــ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ بہت سے مسائل عرف، مقام اور حالاتِ زمانہ پر مبنی ہوتے ہیں ــــ والد صاحبؒ بکثرت فرمایا کرتے تھے کہ فقہاءِ کرام کا مشہور قاعدہ ہے: "مَنْ لَمْ یَعْرِفْ اَھْلَ زَمَانِہٖ فَھُوَ جَاھِلٌ" حالاتِ زمانہ پر جب تک نظر نہ ہو امت کی رہنمائی نہیں کی جا سکتی، فتویٰ اور تفقہ کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ ان حالات میں ہماری ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ قویٰ میں انحطاط ہے، حالات میں ناسازگاری ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے حالات میں گرفتار ہے، علمی صلاحیتیں بھی دن بدن کم ہوتی جا رہی ہیں۔ دوسری طرف مسائل بڑھتے جا رہے ہیں اور نئے نئے علوم سامنے آ رہے ہیں، ان حالات میں اس کے بغیر چارہ کار نہیں ہے کہ جزوی مسائل میں جزوی اجتہاد کے راستے کو روا رکھا جائے، جزوی مسائل میں اجتہاد فی المسائل میں ہمارے تمام فقہاء اور اکابر الحمد للہ بڑے بڑے کارنامے چھوڑ گئے ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی "امداد الفتاویٰ" ایک ایسی چیز ہے جو ان کے اجتہادی کارناموں کا واضح ثبوت ہے اور ساتھ ہی حسین یادگار بھی ہے۔

کیا اجتہاد کا دروازہ بند ہے؟

یہ تصور ہمارے بہت سے حلقوں میں اب بھی موجود ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا ہے۔ والد ماجدؒ فرمایا کرتے تھے کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا، آج بھی بند نہیں ہے اور آئندہ بھی بند نہیں ہوگا، ہاں اس دروازے میں داخل ہونے کے لئے کچھ شرائط ہیں۔ اس زمانہ میں وہ شرائط افراد میں موجود نہیں رہے، اسی واسطے سمجھا جا رہا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا، بھلا قرآن و سنت کا کبھی دروازہ بند ہوگا؟ ہمارے اکابر نئے مسائل میں مسلسل اجتہاد کرتے رہے ہیں۔ امداد الفتاویٰ کو

اُٹھا کر آپ دیکھیں خاص طور سے کتاب البیوع اور معاملات کے جو مسائل ہیں، ان کے اندر اجتہاد فی المسائل آپ کو جگہ جگہ ملے گا، ان میں صرف یہی کام نہیں کیا گیا کہ یہ بتا دیا جائے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز ہے، میں نے اپنے والد ماجدؒ سے بار بار سُنا وہ ہمیں تلقین فرمایا کرتے تھے کہ "معاملات بیوع و شراء سے متعلق، لین دین سے متعلق جب مسائل آئیں تو مفتی کے لئے یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ یہ معاملہ ناجائز ہے، بلکہ وہ یہ بھی بتلائے کہ جائز راستہ بتانا بھی مفتی کی ذمہ داری ہے ورنہ خطرہ ہے کہ بہت سے لوگ دین سے مایوس ہو کر اس طرح مرتد ہو جائیں گے کہ ان کو بھی خبر نہیں ہوگی کہ وہ مرتد ہو گئے ہیں"۔

جدید مسائل کے حل میں فقہاء امت اور علومِ جدیدہ کے ماہرین میں تعاون کی ضرورت

ان حالات میں کسی ایک فرد کے بس کا کام یہ نہیں رہا کہ وہ اجتہاد فی المسائل کسی خاص میدان میں تنہا کر سکے، مثلاً معاملات ہی کے باب میں اجتہاد فی المسائل تنہا کوئی شخص کر سکے، اور سارے مسائل کو حل کر دے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حالاتِ زمانہ نے اور پچھلے دو سو سال کے سیاسی حالات نے جدید و قدیم علوم کے درمیان ایسی خلیج حائل کر دی کہ جن مسائل کا ہمیں حکم معلوم کرنا ہے ان مسائل کی صحیح صورتِ حال ہمیں نہیں معلوم، اور جن حضرات کے سامنے صورت مسئلہ ہے انھیں جواب معلوم کرنے کا راستہ نہیں معلوم۔

میں مُبارکباد پیش کرتا ہوں اسلامک فقہ اکیڈمی کے کارکنان حضرات کو خاص طور سے جناب مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کو کہ انھوں نے اس مشکل مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اسلامی فقہ اکیڈمی قائم کی، جس کے اندر انھوں نے قدیم و جدید دونوں کو ملا دیا اور اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی ہے جو برسوں سے ہمارے درمیان حائل چلی آرہی ہے۔ واقعہ یہ کہ ان مسائل میں جتنی احتیاج علماء اور فقہاء اور مفتی صاحبان کی ہے کم و بیش اس کے قریب قریب ہی احتیاج ہمیں ان جدید علوم کے ماہرین کی ہے جن علوم کے بارے میں ہم شرعی احکام کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جدید علوم کے ماہرین سے ہمیں صورتِ حال معلوم ہوگی یعنی صورت مسئلہ یہ بتائیں گے اور جواب آپ دیں گے۔ اور صورت مسئلہ متعین کرنا بھی آسان کام نہیں ہوتا کیونکہ مشہور مقولہ ہے کہ "السوال نصف العلم" تو نصف العلم جدید علوم کے ماہرین سے حاصل ہوگا اور باقی نصف العلم فقہاء کرام سے، مجھے امید ہے کہ یہ اکیڈمی اس سلسلہ میں مؤثر کردار ادا کرے گی، اور اجتماعی اجتہاد کا میدان ہموار کرے گی۔

اجتماعی اجتہاد و قیاس کی نظیریں:

یہ اجتماعی اجتہاد و قیاس اس امت میں نئی چیز نہیں ہے غور کیا جائے تو پورے تسلسل کے ساتھ اس کی نظیریں ہمیں پچھلے چودہ سو سال کے اندر ملتی ہیں اور خود عہدِ رسالتؐ کے اندر ملتی ہیں، اسارئ بدر (بدر کے قیدیوں) کے واقعہ میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ حضرات علمارِ کرام کو معلوم ہے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ ہوا، اس میں خطا ہوئی اور اس پر عتاب بھی ہوا، یہ اجتماعی اجتہاد تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے بھی ایسی ایک مجلس بنائی تھی، ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں کہ جو بھی نئے مسائل اُمت کو پیش آتے، خلفائے راشدینؓ صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے ان سے دریافت کرتے کہ آپ نے کوئی حدیث اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہو تو بتائیں، اگر حدیث مِل جاتی تو فیصلہ ہو جاتا ورنہ اجتہاد و قیاس سے فیصلہ کیا جاتا تھا۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاگردوں کے ساتھ بحث و مذاکرہ کا سلسلہ قائم فرمایا اور تقریباً چالیس عظیم المرتبت تلامذہ کے ساتھ اجتماعی اجتہاد و قیاس کا سلسلہ جاری رکھا۔ عالمگیرؒ نے فتاویٰ عالمگیریہ مرتب کرنے کیلئے علمار کو جمع کیا، اس زمانہ میں حالات بدلے ہوئے تھے، نئے مسائل پیدا ہوئے تھے انھیں حل کرنے کی ضرورت تھی، اسی لئے فتاویٰ عالمگیریہ مرتب ہوا، اس زمانہ کے فقہار کی جلیل القدر جماعت مقرر کی گئی۔ "مجلۃ الاحکام العدلیہ" خلافت عثمانیہ ترکی میں مرتب ہوا، یہ بھی علمار کرام ہی کی ایک عظیم جماعت نے مرتب کیا، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ نے ستم رسیدہ عورتوں کی مشکلات کا فقہی حل تلاش کرنے کے لئے متعدد حضرات کو "الحیلۃ الناجزہ" کی ترتیب کے لئے مقرر فرمایا، میرے والد ماجدؒ اور مولانا مفتی عبدالکریم گمتھلویؒ ان میں شامل تھے اس میں کئی مسائل میں فقہِ مالکی پر فتویٰ دیا گیا ہے، لیکن اس فتویٰ کو شائع نہیں کیا جب تک کہ ہندوستان کے تمام اربابِ افتار سے مراجعت نہیں ہو گئی، اور اصحاب افتار کی آرار اور تنقیدیں حاصل نہیں ہو گئیں، حرمین شریفین کے فقہار سے خط و کتابت ہوئی، ان تمام مراحل کے بعد اس کو کتابی شکل میں شائع کرایا۔

اجتماعی مسائل میں انفرادی فتاویٰ سے احتراز:

میرے والد محترمؒ فرماتے تھے، ایسے اجتماعی مسائل جو پوری امت کو درپیش ہیں یا ملک کے تمام مسلمانوں کو درپیش ہیں ان میں انفرادی فتاویٰ نہ دیئے جائیں ان میں باہمی مشورہ نہایت ضروری ہے۔ اور تمام بزرگوں کا یہی طریقہ رہا ہے۔ چنانچہ پاکستان میں بھی حضرت والد ماجدؒ اور حضرت مولانا

محمد یوسف بنوریؒ نے ایک مجلس قائم کر رکھی تھی جو آج بھی "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کے نام سے موجود ہے۔ اس مجلس کی طرف سے کئی رسائل شائع ہوئے، ایک ایک مسئلہ پر بعض اوقات دو دو سال تک تحقیق ہوتی رہی۔

اپنے خیالات پر تنقید سننے میں وسیع الظرفی:

میں عرض کروں گا کہ اپنے بزرگوں نے ہمیں یہ طریقہ بھی بتلایا ہے کہ مسائل کی تحقیق اور اپنے خیالات پر تنقید سننے کے معاملہ میں کتنا وسیع الظرف ہونا چاہئے، میں اور میرے بھائی مولانا محمد تقی عثمانی اس زمانہ میں جب یہ مجلس اعضاء انسانی کی پیوندکاری کے مسئلہ پر، اور پراویڈنٹ فنڈ (P.F.) اور دوسرے مسائل پر تحقیق کر رہی تھی، درجہ تخصص فی الافتاء میں زیر تربیت تھے، آپ جانتے ہیں کہ وہ آدمی جو ابھی درس نظامی سے فارغ ہوا ہو اور درجہ تخصص فی الافتاء میں تربیت حاصل کر رہا ہو اس جیسی مجلس میں وہ کیا مشورے دے سکتا ہے، کیا مدد پہنچا سکتا ہے، لیکن ہم دونوں بھائیوں کو اور تخصص فی الافتاء کے دیگر طلبہ کو اس مجلس میں والد صاحبؒ علماء کے ساتھ حکماً بٹھاتے اور ہم سب کو بحث و تحقیق میں شریک کرتے تھے؛ اس میں انھوں نے ہمیں اتنا جری بنا دیا تھا کہ جہاں مفتیٔ اعظم پاکستان اور مولانا محمد یوسف بنوری جیسے جلیل القدر علماء گفتگو کر رہے ہوں، مسائل پر اجتہادی بحث کر رہے ہوں وہاں ہم لوگ صبح سے شام تک نہ جانے کتنی بار ان کی بات پر اعتراض کرتے، اور ان سے سوالات کرتے تھے ۔۔ ان دونوں حضرات کو میں نے دیکھا کہ ہماری طالبعلمانہ آراء کو وہ ایسے ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے جیسے کسی پیاسے کے سامنے پانی آگیا ہو، ظاہر ہے کہ اس کی یہ وجہ نہیں کہ ہمارے پاس دلائل زیادہ وزنی تھے، بلکہ وہ ہماری تربیت کر رہے تھے، ہمیں یہ بتلا رہے تھے کہ فقہی مسائل میں جہاں یہ ضروری ہے کہ ہم پورا پورا وقت دیں اور صلاحیتیں صرف کریں یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو پوری توجہ اور حق پسندی کے ساتھ سنیں، اس کے بغیر کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے مجھے اُمید ہے کہ ہم ان شاء اللہ اسی جذبہ کے ساتھ اس سیمینار کے تمام مباحث میں حصہ لیں گے کہ ہم ہر ایک کی بات اسی توجہ کے ساتھ سنیں گے جیسے کوئی طالب علم اپنے اُستاد کی بات سنتا ہے، اس طرح ہم لوگ بہت سارے نتائج تک پہنچ سکیں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان شاء اللہ مدد ہوگی۔

ہمارے بزرگوں کا ایک خاص امتیاز:

ہمارے بزرگوں کا ایک طغریٰ امتیاز

ہے بلکہ پوری امت کے علماء اہل سنت والجماعت کے تمام فقہاء کا یہ طغرئ امتیاز رہا ہے کہ انھوں نے اپنی بات کی پچ نہیں کی، یہ حضرات علمی غرور، انانیت، اور بات کی پچ سے بہت دور تھے۔ ہمارے فقہاء کرام اور اپنے تمام بزرگ، اور جن بزرگوں کو ہم نے دیکھا اور جن کی جوتیاں سیدھی کیں ان کو بھی ہم نے اسی اعلیٰ ظرفی کا حامل پایا کہ ایک ادنیٰ طالب علم ان کی کسی بات پر کوئی اعتراض کر دے تو نہ صرف یہ کہ اُس کو توجہ کے ساتھ سُنتے تھے، بلکہ اگر سمجھ میں آجائے تو فوراً قبول فرمالیتے تھے اور اپنی بات سے رجوع بھی کر لیتے تھے۔

چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب علیہ الرحمہ نے "امداد الفتاویٰ" میں حوادث الفتاویٰ کے ساتھ ساتھ ترجیح الراجح کا بھی ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا، چنانچہ اگر کسی عالم نے کسی مسئلہ میں ان کی کسی غلطی کی طرف توجہ دلائی اور حضرت کی رائے تبدیل ہوگئی تو صرف یہی نہیں کہ ان کو خط لکھ دیا کہ میں نے رجوع کر لیا ہے، بلکہ اس کو "ترجیح الراجح" میں شائع کیا جاتا تھا کہ میں نے پہلے اس مسئلہ کا جواب یہ لکھ دیا تھا، فلاں صاحب کے توجہ دلانے یا بعض حضرات کے توجہ دلانے سے اب میری رائے یوں ہوگئی ہے، اور میں پچھلے قول سے رجوع کرتا ہوں، اب میرا فتویٰ یہ ہے ــ اس میں کبھی ان حضرات نے نہ کوئی شرم محسوس کی اور نہ ہی کسی دوسرے نے اُن کے درجہ میں کمی محسوس کی، بلکہ ان کے اس اعتراف نے ان کی عظمت میں اضافہ کیا ہے۔ ہمارے والد ماجدؒ کے فتاویٰ کا مجموعہ امداد المفتیین کے نام سے شائع ہوا (جو دراصل اس کا تھوڑا سا حصہ ہے اگر مکمل شائع ہو جائے تو بیس پچیس جلدیں ہوں گی) اس میں بھی حضرت نے ایک مستقل باب قائم کیا تھا، "اختیار الصواب لمختلف الابواب" اگر کسی مسئلہ میں ان کی رائے تبدیل ہو جاتی تو رجوع فرما کر اس باب میں شائع فرما دیتے تھے۔ اس بات کو میں اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ اِس زمانہ میں ہمارے بزرگوں کی یہ سنت مُردہ ہوتی جا رہی ہے۔ کسی ایک مفتی کے قلم سے اگر ایک فتویٰ نکل گیا تو اب یہ بہت کم رہ گیا ہے کہ توجہ دلانے اور خطا ظاہر ہونے پر رجوع کر لیں۔ اب بھی الحمد للہ ایسے حضرات علماء حق موجود ہیں جن کے سامنے اگر دلائل ان کے معارض آجائیں تو رجوع بھی کرنے میں ان کو تامل نہ ہوگا، لیکن اب ایسے حضرات بہت شاذ و نادر ہیں، ورنہ ہر ایک اس کوشش میں رہتا ہے کہ میرے قلم سے جو بات نکلی ہے، اس کو منوایا جائے۔

اعضاء انسانی کی پیوندکاری:

ہم نے اپنے بزرگوں کو الحمد للہ دیکھا ہے اور ان سے سیکھا ہے، اعضاء انسانی کی پیوند

کاری کے مسئلہ میں مجلس تحقیق مسائل حاضرہ میں تقریباً دو سال تک بحث ہوتی رہی ہے، بے شمار سوالات آئے ہوئے تھے، ان سب کو روکا گیا تھا اور پوچھنے والوں کو لکھ دیا گیا تھا کہ اس مسئلہ پر تحقیق ہو رہی ہے وقت لگے گا، جب تحقیق ہو جائے گی تو آپ کو جواب دیا جائے گا۔ سوال یہ تھا کہ ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے جسم میں منتقل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز ایک انسان کا عضو تناسل کاٹ کر دوسرے انسان کو لگانا اگر ممکن ہو جائے تو اس کا کیا اثر پڑے گا، ثبوت نسب سمیت حلال و حرام کے بہت سارے مسائل پیدا ہوں گے، اس بنا پر سوالات کی تحقیق شروع ہوئی اور جواب لکھا گیا، اس جواب کا حاصل یہ تھا کہ انسانی اعضاء سے پیوند کاری تو جائز نہیں، البتہ ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے بدن میں داخل کرنا حالتِ ضرورت میں جائز ہے، فروخت کرنا جائز نہیں، کوئی شخص اگر پیسوں کے بغیر نہیں دیتا تو قیمت دینے والا اگر مجبور ہے تو گنہگار نہیں ہوگا، قیمت لینے والا گنہگار ہوگا، یہ حاصل تھا اس جواب کا، — حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے بعد اعضاء انسانی کے متعلق عالمِ اسلام کے دیگر دار الافتاؤں سے کچھ فتاویٰ جاری ہوئے جو ہماری نظروں سے گذرے، اور بھی کچھ حضرات علماء کرام نے اس سلسلے میں جو کام کیا تھا اس میں کچھ نئے دلائل ایسے سامنے آئے جن سے اس بات کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے کہ اس مسئلہ پر از سرِ نو غور کیا جائے، بہت ممکن ہے کہ جو فتویٰ عدم جواز کا دیا گیا تھا اور پاکستان میں شائع ہوا تھا ان دلائل پر غور و مشورے کے بعد اس فتویٰ سے رجوع کیا جائے۔ اس فتوے پر دستخط کرنے والے جو حضرات موجود ہیں وہ رجوع کر لیں گے اور جو حضرات اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں ہمیں اُمید ہے کہ ان کی روحوں کو اس سے تسکین ہوگی۔

معروضات کا خلاصہ:

میری معروضات کا خلاصہ دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ اپنی بات کی تیچ اور اپنی بات کو ہر قیمت پر منوانے کی کوشش، یہ ہر تحقیق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے ہمیں اس سے بہر حال بچنا چاہیے اور دوسرے یہ کہ اجتماعی مسائل میں باہمی مشورہ کے بغیر انفرادی فتاویٰ جاری کرنے سے حتی الامکان گریز کرنا چاہیے، اجتماعی اجتہاد و قیاس کا جو کام اسلامی فقہ اکیڈمی نے اپنے سر لیا ہے، وہ عظیم کام ہے، مشکل ہے، کٹھن ہے، لیکن وقت کی سب سے بڑی پکار ہے۔

جدید فقہی مسائل کے بارے میں علماءِ پاکستان کی کوششیں:

پاکستان میں بھی الحمد للہ اس سلسلہ میں خاصی پیش رفت اور خاصا کام ہوا ہے، چونکہ مجھ

سے خاص طور پر فرمائش کی گئی ہے کہ اس سلسلہ میں بھی کچھ عرض کروں، اس لئے چند منٹ اس موضوع پر بھی لوں گا۔ نجی طور پر تو وہاں بھی اسی طرح کام چل رہا تھا جیسا کہ یہاں ہندوستان میں بھی الحمدللہ جگہ جگہ ہو رہا ہے، پاکستان میں بھی بعض علماء کرام نے بعض مجالس قائم کی ہیں جیسے "مجلس تحقیق مسائلِ حاضرہ"، لیکن بڑے پیمانے پر کام کی ضرورت تھی جس میں تمام مکاتب فکر کے علماء، علماء دیوبند، علماء بریلی، اہلِ حدیث، سب حضرات جمع ہوں، اور ان مسائل کا حل تلاش کریں، اس سلسلہ میں سرکاری سطح پر افسوس ہے کہ ۱۹۷۷ء سے پہلے کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نہیں ہوئی، ۱۹۷۷ء میں پاکستان میں ایسے حالات پیش آئے کہ جنرل محمد ضیاء الحق صاحب مرحوم کو زمامِ اقتدار سنبھالنی پڑی، جب وہ آئے تو ہم سب لرزہ براندام تھے کہ ایک فوجی جنرل آگیا ہے، پتہ نہیں کس مزاج و مذاق کا انسان ہوگا، کس راستہ پر چلے گا، لیکن جب اس کو قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ الحمدللہ یہ علماء کرام اور بزرگوں کا عقیدت مند ہے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے انھیں خاص عقیدت تھی۔ ان کے بہنوئی حضرت تھانویؒ سے بیعت تھے، انھوں نے الحمدللہ کئی بڑے کام کئے جن میں سے صرف بعض کا تذکرہ مختصر وقت میں کر سکوں گا۔

اِسلامی نظریاتی کونسل کی خدمات:

ایک "اسلامی نظریاتی کونسل" جو دستور کی رو سے پہلے سے ضروری تھی اور پہلے سے موجود تھی، لیکن اس میں علماء کو نہیں رکھا گیا تھا، اس میں انھوں نے یہ کیا کہ اچھے اچھے ماہر علماء کو اسلامی نظریاتی کونسل میں شامل کیا۔ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ حضرت مولانا شمس الحق افغانی، مولانا محمد تقی عثمانی صاحب اور بڑے بڑے علماء کرام کو اس میں شامل کیا اور ان سے کہہ دیا کہ اس کام میں جن وسائل کی ضرورت ہوگی وہ سب آپ کو فراہم کئے جائیں گے، بس جو کام آپ حضرات اسلامی فقہ اکیڈمی سے کر رہے ہیں الحمدللہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل نے کئی سال بڑی تیز رفتاری کے ساتھ کیا، اور جو مسائل درپیش تھے ان کو حل کیا لیکن ان کا کام زیادہ تر قانون سازی سے متعلق تھا کہ ان میں کیا کیا تبدیلیاں لائی جائیں، اگرچہ وہ بھی بہت بڑا کام تھا، کونسل کے ذمہ داروں سے جنرل ضیاء الحق صاحب نے کہا کہ آپ لوگ بینکنگ کو بلکہ پورے مالیاتی نظام کو سود سے پاک کرنے کے لئے تجاویز دیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے ایک پینل مقرر کیا، جس میں متبحر علماء بھی تھے، بینکنگ کے ماہرین بھی، اور جدید ترین ماہرین اقتصادیات کے ماہرین بھی۔ پینل نے شب و روز محنت کر کے اسلامی بینک کاری اور بلا سود بینک کاری پر ایک مفصل اور جامع رپورٹ تیار کی، یہ تو آپ حضرات کو معلوم ہوگا کہ الحمدللہ پورے عالمِ اسلام میں بلکہ صرف مُسلم

ممالک ہی میں نہیں دیگر ممالک میں بھی جہاں مسلمان آباد ہیں، اب یہ جذبہ قوت سے پیدا ہو رہا ہے کہ سودی نظام جس کو اللہ رب العالمین نے اعلانِ جنگ قرار دیا ہے اس سے جس طرح بھی ممکن ہو جان چھڑائی جائے، مختلف ملکوں میں اسلامی بینک کاری اور بلاسود بینک کاری پر کام ہوئے اور ہو رہے ہیں، لیکن مجھے یہ بتاتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل نے جو رپورٹ تیار کی ہے وہ اسلامی اور بلاسود بینک کاری کے بارے میں اس وقت تک جتنی رپورٹیں عالمِ اسلام میں تیار ہوئی تھیں، ان میں سب سے زیادہ جامع اور بہتر رپورٹ ہے صدر صاحب مرحوم نے وزارتِ خزانہ کو حکم دیا کہ اس رپورٹ کے مطابق عمل درآمد کیا جائے، اور ہمارا پورا مالیاتی نظام سود سے پاک کیا جائے، لیکن یہ ہماری شامتِ اعمال ہے کہ وزارتوں، مالیات کے محکموں، اور ان جیسے اداروں کے حضرات سودی نظام کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ ان کو ادنیٰ قسم کی بھی کوئی کراہت اس میں نظر نہیں آتی بلکہ وہ اس درجہ عادی ہو چکے ہیں کہ اس کو چھوڑنے کو ان کا دل، اگر کوئی معقول عذر نہ ہو تب بھی نہیں چاہتا، الا ماشاء اللہ، وہ رپورٹ وزارتِ خزانہ میں گئی، وہاں سے اسٹیٹ بینک کے پاس پہنچی تو اسٹیٹ بینک نے بینکنگ اور سرمایہ کاری کے بارہ طریقے وہی مقرر کئے جو اسلامی نظریاتی کونسل نے تجویز کئے تھے لیکن ان سب بارہ کے بارہ طریقوں کو ایسا تحریف زدہ کیا کہ نام تو ہوا بلاسود بینک کاری کا، مگر سود اور ناجائز معاملات جوں کے توں برقرار ہے۔ اس کی شکایت علماء کرام نے کی، ہم نے بھی بار بار ضیاء الحق صاحب سے عرض کیا کہ آپ یہ کام نہ کریں کہ غیر سودی بینک کاری کے نام سے سودی بینک کاری کی جائے، اس صورت میں لوگ حلال سمجھ کر حرام کھائیں گے، توبہ اور استغفار کی توفیق سے بھی محروم رہیں گے، اس کی اصلاح کی جائے، انہوں نے وعدہ کیا کہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے علماء کو اور وزارتِ خزانہ کے لوگوں کو پھر جوڑ کر بٹھاؤں گا، لیکن شاید موقع میسر نہ آسکا یہاں تک کہ مسلم لیگ کی حکومت قائم ہو گئی اور وہ انتظامِ حکومت سے الگ ہو گئے۔ صدر ضیاء الحق بحیثیتِ صدر برقرار رہے لیکن انتظامِ حکومت جمہوری حکومت کے پاس آگیا، پھر ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو پچھلے سال جب انہوں نے اسمبلی اور مسلم لیگی حکومت کو برطرف کر دیا تو انہوں نے نفاذِ شریعت آرڈی ننس نافذ کیا، اور اس کے تحت انہوں نے جہاں عدالتوں کو موجودہ غیر اسلامی قوانین کو کالعدم قرار دینے کے اختیارات دیئے اسی کے ساتھ انہوں نے دو کمیشن قائم کئے: ایک اسلامی اقتصادی کمیشن، ایک اسلامی تعلیمی کمیشن۔

اسلامی اقتصادی کمیشن پاکستان کی خدمات:

اسلامی اقتصادی کمیشن کو انہوں نے اسلامی نظریاتی کونسل سے زیادہ طاقتور بنایا تھا،

اس معنی کے لحاظ سے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے ذمہ تو صرف اتنا کام تھا کہ وہ سفارشات پیش کر سکے، اس کمیشن کو یہ اختیار بھی دیا کہ مالیاتی ادارے جن میں اسٹیٹ بینک اور پاکستان کے تمام بینک شامل تھے۔ ان تمام اداروں کی اس طرح نگرانی بھی کرے کہ عدمِ تعمیل کے واقعات حکومت کے علم میں لائے۔ یہ اقتصادی کمیشن صرف پانچ ارکان پر مشتمل تھا جن میں مجھ ناکارہ کا نام بھی شامل تھا۔ اور خاص طور سے اسٹیٹ بنک کے گورنر کو بھی اس کا رکن مقرر کیا گیا تاکہ کمیشن کی رپورٹ پر عمل درآمد آسان ہو۔ میں نے ان سے عرض بھی کیا کہ آپ نے مجھے اس کا رکن بنا تو دیا ہے مگر مجھے انگریزی نہیں آتی، متعلقہ سارا لٹریچر انگریزی میں ہے، میں نے بعض دیگر علماء کے نام پیش کئے اور صدر صاحب سے کہا کہ یہ حضرات انگریزی بھی جانتے ہیں اقتصادیات پر بھی ان کی نظر ہے ان میں سے کسی کو لے لیں، انہوں نے ناموں کا وہ پرچہ لیکر مجھ سے کہا کہ آپ تو رہیں، مزید کسی کی ضرورت ہوگی تو کمیشن میں ان کو بھی شامل کر لیا جائے گا۔ ہم آپ کو تکلیف نہیں ہونے دیں گے، ہم آپ کو ایسا اسسٹنٹ دیں گے جو آپ کی ہدایت کے مطابق ہر چیز جمع کر کے اور ترجمہ کر کے آپ کو پیش کیا کرے گا۔

یہ واقعہ صدر ضیاء الحق صاحب کے شہید ہونے سے تقریباً دس دن پہلے کا ہے، یہ ان سے ہماری آخری ملاقات تھی۔ اس روز انھوں نے کمیشن کا پہلا اجلاس اپنی معیت میں بلایا تھا۔ اس میں انھوں نے دل کھول کر رکھ دیا، انھوں نے کہا کہ میں ہر قیمت پر مالی نظام کو سود سے پاک کرنا چاہتا ہوں اور یہ ذمہ داری آپ کے سپرد کر رہا ہوں کہ آپ سفارشات پیش کریں گے اور میں اس کا نفاذ کروں گا میں ہر مہینے میں کم از کم ایک بار آپ حضرات کے ساتھ پورے پورے دن بیٹھوں گا۔ پھر کہنے لگے وقت کافی نہیں ہے نومبر میں انتخابات ہونے ہیں، پھر جب مجلس برخواست ہوگئی تو مجھ سے پوچھا آپ اسلام آباد میں ایک دو روز ٹھہریں گے؟ میں نے کہا کہ مجھے تو یہاں (ایوانِ صدر) سے سیدھا ائیرپورٹ جانا ہوگا، لیکن اگر ضرورت ہو تو میں رک جاؤں گا۔ اتنے میں کمیشن کے دیگر اراکین بھی آگئے۔ ہم سب سے پھر کہنے لگے کل تو فوج کے ساتھ مشغول ہوں، پرسوں ملاقات ہو سکے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ساتھ بیٹھوں اور اس مسئلہ پر تفصیل سے گفت گو ہو۔ تاکہ ہم سب اس مسئلہ کو جلد آگے بڑھا سکیں۔ پھر کہنے لگے "لیکن اس طرح آپ حضرات کا کل کا دن بیکار جائے گا۔ اچھا آپ حضرات کو چند روز میں پھر زحمت دوں گا"۔ پھر ۱۷ اگست کو اللہ تعالیٰ نے ان کو تو شہادت کے مرتبہ پر سرفراز فرما دیا۔ مگر کمیشن وجود میں آچکا تھا، الحمدللہ کمیشن نے کام جاری رکھا اور اس میں چونکہ گورنر اسٹیٹ بینک خود موجود تھے اس لئے اسٹیٹ بینک کی طرف سے کسی اعتراض اور رکاوٹ کا راستہ نہیں رہا، الحمدللہ اس کمیشن نے آٹھ مہینے میں ایک جامع اور مفصل رپورٹ بلاسود بینکاری کی تیاری کی، اس رپورٹ کی تیاری کیلئے ہم نے اپنی ایک ذیلی کمیٹی بنائی تھی،

جس میں کمیشن سے باہر کے ماہرین بینکاری اور دار العلوم کراچی کے دیگر کئی علماء کرام سے بھی استفادہ کیا گیا، خصوصاً بینکنگ کونسل کے سابق چیرمین جناب حاجی عبدالجبار صاحب، اور میرے برادرِ عزیز مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے تو اس میں اوّل سے آخر تک بنیادی حصہ لیا، اس کمیٹی کے اجلاسات دار العلوم کراچی میں صبح سے رات تک جاری رہتے تھے، دار العلوم کراچی کے "تخصص فی الافتاء" میں زیرِ تربیت طلبہ کو بھی مسائل وجزئیات کی تلاش وجستجو میں شریک کیا گیا۔

الحمد للہ اس مربوط کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ ماہرین بینکاری کے سامنے جو عملی مشکلات تھیں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وہ سب حل ہوگئیں۔ اور ایک جامع رپورٹ تیار ہوگئی۔ پھر یہ اہتمام کیا گیا کہ یہ رپورٹ بنکوں اور مالیاتی اداروں کے سربراہوں کو بھی غور وفکر کیلئے پیش کی گئی، ان حضرات نے کچھ نئی عملی مشکلات پیش کیں، ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے حل کرادیا۔ اس کے بعد کارخانہ داروں، صنعت کاروں اور بڑے تاجروں کے ساتھ مشورہ ہوا، ان کے سامنے جو عملی الجھنیں تھیں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وہ بھی دُور ہوگئیں۔ اس طرح بلاسُود بنکاری کی یہ رپورٹ ہر طرح قابلِ عمل ہونے کے ساتھ شرعی اعتبار سے بھی اطمینان بخش صورت میں تیار ہوگئی۔

اس رپورٹ کے تیار ہوتے ہی کمیشن کا اجلاس طلب کیا گیا، تاکہ کمیشن اس کا آخری جائزہ لیکر اسے حتمی شکل دیدے اور حکومت کو پیش کردے۔

ہم بجا طور پر سمجھ رہے تھے کہ اس رپورٹ پر اگلے بجٹ سے عمل درآمد شروع ہوجائے گا، اور اس طرح ہماری زندگیوں کی قیمت وصول ہوجائے گی، کیونکہ اس رپورٹ کا حاصل یہ تھا کہ پورے ملک میں سارے بینکوں کا نظام سُود سے بالکلیہ پاک ہوجاتا، اور اب اس میں کوئی فنی یا عملی مشکل بھی باقی نہیں رہی تھی۔ بینکار، صنعتکار، اور تجار سب متفقہ طور پر اس رپورٹ کو ہر اعتبار سے قابلِ عمل مُفید اور مناسب قرار دے چکے تھے۔

لیکن جس روز کمیشن کا یہ اجلاس ہونے والا تھا، اُس سے ایک روز قبل اسلام آباد سے اچانک فون آیا کہ اس "اسلامی اقتصادی کمیشن" کا وجود قانونی طور پر ختم ہوچکا ہے، کیونکہ اسے صدر ضیاء الحق صاحب مرحوم نے "نفاذِ شریعت آرڈی ننس" کے تحت قائم کیا تھا، صدارتی آرڈی ننس کی توثیق اگر اسمبلی نہ کرے تو وہ آرڈی ننس چار مہینے میں خود بخود ختم ہوجاتا ہے، البتہ صدر چاہے تو مزید چار ماہ کیلئے اس کی تجدید کرسکتا ہے، چنانچہ جب چار مہینے پورے ہوئے تو پاکستان کے موجودہ صدر جناب غلام اسحٰق صاحب نے اس آرڈی ننس کی مزید چار ماہ کیلئے تجدید بھی کردی تھی، اس طرح کمیشن کو اپنا کام کرنے کیلئے کل آٹھ ماہ مل گئے، لیکن جب یہ آٹھ مہینے مکمل ہوئے تو ملک میں اسمبلی وجود میں آچکی تھی، جس نے

"نفاذِ شریعت آرڈی ننس" کی توثیق نہیں کی، بلکہ اسمبلی میں اس کو زیرِ بحث ہی نہیں لایا گیا، اس طرح "نفاذِ شریعت آرڈی ننس" کے ساتھ یہ کمیشن بھی ختم ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

تاہم کمیشن کی ذیلی کمیٹی کی تیار کردہ یہ رپورٹ ایک اہم علمی دستاویز ہے۔ جس سے اللہ تعالےٰ کو منظور ہوا تو پاکستان کی کوئی بھی حکومت استفادہ کر سکتی ہے۔

باہمی ربط کی ضرورت:

بہرحال مجھے اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ الحمدللہ یہ اجتماعی اجتہاد و قیاس کا کام پاکستان میں بھی چل رہا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ جو کام یہاں ہو رہا ہے اور جو کام وہاں ہو رہا ہے ان دونوں کے مابین ربط ہو اور ایک دوسرے کی معلومات اور تحقیق سے ہم استفادہ کریں، اللہ تعالےٰ ہماری ان تمام مشکلات اور مسائل میں مدد فرمائے، رہنمائی فرمائے، اور ہمیں اپنے اسلاف کی راہ راست پر چلتے ہوئے ان مسائل پر پوری توانائیاں خرچ کرنے کی توفیقِ کامل عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

قسط ۳

قرطبہ:

قرطبہ اندلس کے قدیم شہروں میں سے ہے، دوسری صدی قبلِ مسیح کی تاریخ میں بھی اس کا ذکر ایک بستے بستے شہر کی حیثیت سے ملتا ہے، اور اس وقت اسے "کوردوبا" (CORDOBA) کہا جاتا تھا۔ جب پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں نے اندلس فتح کیا تو یہاں قوطیوں کی حکومت تھی۔ طارق بن زیاد نے ۹۲ھ میں اسے فتح کیا۔ مسلمان فوجوں نے اہلِ شہر کے ساتھ بڑی فراخ دلی اور رعایت کا معاملہ کیا۔ مسلمانوں نے اندلس فتح کرنے کے بعد شروع میں اشبیلیہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا، لیکن سلیمان بن عبدالملک کے دور میں والیٔ اندلس سمح بن مالک خولانی نے دارالحکومت اشبیلیہ سے قرطبہ منتقل کرلیا، اور اس کے بعد یہ صدیوں اندلس کا دارالخلافہ بنا رہا۔ ۱۳۸ھ میں جب عبدالرحمٰن الداخل نے یہاں اموی سلطنت قائم کی تو اس کے بعد سے اس شہر کو زبردست ترقی ہوئی۔

اموی خاندان نے قرطبہ پر تین صدی سے زائد حکومت کی، اس کے بعد یکے بعد دیگرے یہاں بنی حمود، بنی جہور، بنی عباد، مرابطین اور موحدین کی حکومتیں قائم ہوتی رہیں، یہاں تک کہ ۶۳۴ھ میں قسطلہ کا عیسائی بادشاہ فرڈی نند اس پر قابض ہوگیا۔ اس طرح اس شہر پر مسلمانوں کی حکومت ۵۳۴ سال قائم رہی۔

مسلمانوں کے دور میں قرطبہ دنیا کے متمدن ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا، یہ شہر اکیس بڑے بڑے محلوں پر مشتمل تھا۔ خلیفہ ہشام المؤید کے زمانے (۳۶۶ھ ۔ ۳۹۹ھ) میں شہر کا سروے کیا گیا تو شہر کے مکانوں کی تعداد ڈھائی لاکھ سے متجاوز تھی۔ دکانوں کی تعداد اسّی ہزار چار سو شمار کی گئی۔ عبدالرحمٰن داخل کے زمانے (۱۳۸ھ ۔ ۱۷۲ھ) میں شہر کی مسجدوں کی تعداد چار سو نوے تھی، اور بعد میں سولہ سو مساجد تک کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔[1]

---

[1] نفح الطیب ص ۹۷، ج ۲

مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں جو عظیم الشان عمارتیں، شاندار سڑکیں، زبردست پُل، اپنے دَور کے لحاظ سے زبردست کارخانے اور جدید تمدنی سہولیات قرطبہ کو دیں، اُن کا تذکرہ کرنے کیلئے مورخین اور ادیبوں نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اور اندلس کے مشہور مورخ مقری نے "نفح الطیب" کی ایک پوری جلد قرطبہ ہی کے تذکرے کیلئے وقف کی ہے۔

علم و فضل کے لحاظ سے بھی "قرطبہ" اندلس کا عظیم ترین شہر سمجھا جاتا تھا، اندلس سے علم و دانش کے ہر میدان میں جو فقاد اور عالمی شخصیتیں پیدا ہوئیں، اُن میں سے بیشتر قرطبہ ہی سے تعلق رکھتی تھیں، مشہور مفسر اور صحیح مسلمؒ کے شارح علامہ قرطبیؒ، فقہ اور فلسفہ کے امام علامہ ابن رُشدؒ، مسلکِ اہلِ ظاہر کے سرخیل علامہ ابنِ حزمؒ، طِب اور سرجری کے مسلّم الثبوت سائنس دان ابوالقاسم زہراوی، سب اسی شہر میں دادِ علم و فضل دیتے رہے۔

قرطبہ کے کتب خانے دُنیا بھر میں ضرب المثل تھے۔ علم و ادب کے ذوق اور اس کے ہمہ گیر چرچے کا عالم یہ تھا کہ کوئی گھر ایک اچھے کتب خانے سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ معاشرے میں سب سے بڑی قابلِ ذکر بات یہ سمجھی جاتی تھی کہ فلاں شخص کے پاس فلاں کتاب کا ایک ایسا نادر نسخہ ہے جو کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ جو لوگ طبعی طور پر کتابوں کا ذوق نہ رکھتے ہوں، انہیں معاشرے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا، چنانچہ بہت سے لوگ محض فیشن کے طور پر اپنے گھروں میں کتابوں کی الماریاں رکھتے، اور انہیں مختلف علوم و فنون کی کتابوں سے سجاتے تھے۔

اس سلسلے میں مقریؒ نے ایک حضرمی شخص کا ایک دلچسپ واقعہ اسی کے الفاظ میں نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک نادر کتاب کی ضرورت تھی، میں اس کی تلاش میں قرطبہ آیا، اور کتابوں کے سارے بازار چھان لئے۔ بالآخر ایک جگہ کتابوں کا نیلام ہو رہا تھا، وہاں مجھے وہ کتاب مِل گئی جس کی مجھے ضرورت تھی، میں اُسے دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑا، اور اسے حاصل کرنے کیلئے زیادہ سے زیادہ بولی لگانی شروع کر دی۔ لیکن جونہی میں کوئی بولی لگاتا، ایک دوسرا شخص اُس سے آگے بڑھ کر بولی لگا دیتا۔ ہوتے ہوتے اُس شخص نے اتنی قیمت کی بولی لگا دی کہ وہ حد سے زیادہ تھی۔ میں نے نیلام کرنے والے سے کہا کہ ذرا مجھے اس شخص سے مِلاؤ جو یہ حد سے زیادہ بولی لگا رہا ہے۔ اُس نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو اپنے لباس سے کوئی رئیس معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُس سے جا کر کہا کہ "آپ کوئی بڑے فقیہ معلوم ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کی عزت میں اضافہ کرے، اگر واقعۃً آپ کو اس کتاب کی ضرورت ہے تو میں آپ کے حق میں دستبردار ہو جاتا ہوں"۔

اُس شخص نے جواب دیا "میں کوئی فقیہ نہیں ہوں، بلکہ مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ اس کتاب میں کیا ہے؟ لیکن میں نے بڑی محنت سے اپنے گھر میں ایک کتب خانہ بنایا ہے جو شہر کے شرفاء میں کوئی مقام پا سکے۔ ایک الماری میں تھوڑی سی جگہ خالی ہے جس میں یہ کتاب سما سکتی ہے۔ اس کتاب کی جلد بھی بہت خوبصورت

ہے، اور تحریر بھی بہت حسین ہے، اس لئے میں اُس جگہ کو پُر کرنے کیلئے یہ کتاب خریدنا چاہتا ہوں۔ اس پر میں نے اس سے کہا کہ "بادام اس شخص کو مل رہا ہے جس کے مُنہ میں دانت نہیں" [۱]

ایک مرتبہ قرطبہ کے مشہور عالم علامہ ابن رشدؒ اور اشبیلیہ کے رئیس ابوبکر بن زھر کے درمیان یہ بحث چھڑ گئی کہ قرطبہ بہتر ہے یا اشبیلیہ۔ ابوبکر ابن ازھر نے اشبیلیہ کی بہت سی خوبیاں بیان کیں تو علامہ ابن رشدؒ نے جواب دیا:

"آپ جو خوبیاں بتا رہے ہیں، ان کا تو مجھے علم نہیں، البتہ میں اتنا جانتا ہوں کہ جب اشبیلیہ میں کسی عالم کا انتقال ہوتا ہے تو اس کا کتب خانہ بکنے کیلئے قرطبہ آتا ہے، اور جب قرطبہ میں کسی گویّے کا انتقال ہوتا ہے تو اس کا ساز و سامان بکنے کیلئے اشبیلیہ جاتا ہے۔" [۲]

جس شہر میں کتابوں اور کتب خانوں کے ساتھ عوام کی محبت کا یہ عالم ہو، اس کی علمی اور ادبی فضا کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، چنانچہ قرطبہ کی خواتین اور بچّے تک اس علمی ذوق سے جس طرح سرشار تھے اس کا حال مؤرخین نے بڑے شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

شہر بھر پر چھائے ہوئے اس علمی ذوق کا نتیجہ تھا کہ قرطبہ کے لوگ اپنی شرافت و نجابت اپنی خوش اخلاقی، خوش وضعی اور سنجیدگی میں نہایت ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ اور سامانِ عیش کی فراوانی، مناظرِ قدرت کے حسن، آب و ہوا کی نشاط انگیزی اور تفریح گاہوں کی کثرت کے باوجود وہ اوچھی حرکتوں، اور خلافِ تہذیب منکرات سے کوسوں دُور تھے۔ اندلس کے ایک باشندے اہلِ قرطبہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ بہترین اور صاف ستھرا لباس پہنتے ہیں، دینی احکام کی پوری پابندی کرتے ہیں، نمازیں پابندی سے پڑھتے ہیں، تمام اہلِ قرطبہ شہر کی جامع مسجد کی بڑی تعظیم کرتے ہیں، اگر کسی بھی شخص کو کہیں کوئی شراب کا کوئی برتن نظر آجائے تو وہ اسے بلا تکلف توڑ ڈالتا ہے، وہ ہر طرح کے منکرات سے نفرت کرتے ہیں، اور ان کا سرمایۂ فخر و ناز تین چیزیں ہوتی ہیں، ایک خاندانی شرافت، دوسرے سپہ گری اور تیسرے علم۔" [۳]

جس قرطبہ کے یہ حالات کتابوں میں پڑھے تھے، اور جس کی حسین فضا میں لکھی ہوئی کتابیں آج بھی مجھ جیسے طالب علم کیلئے رہنمائی کا عظیم ذخیرہ ہیں، آج وہی قرطبہ نگاہوں کے سامنے تھا، لیکن دُنیا بدلی ہوئی تھی، نہ وہ دین و ایمان، نہ وہ علم و فضل، نہ وہ مسجدیں اور درسگاہیں، نہ وہ کتب خانے اور کتابیں، نہ وہ شرافت و متانت، نہ وہ عالی دماغ انسان جنہوں نے اس خطّے کو دُنیا بھر میں سرافرازی

---

[۱] نفح الطیب ص ۱۵۴ ج ۲ [ملحقہ نشان: ۲۹۶ الف]

ع طا کی تھی، اب تو میرے سامنے بیسویں صدی کے یورپ کا ایک شہر تھا جس کی وسیع سڑکوں پر مادہ پرستی کی دوڑ ہو رہی تھی، جس کی دو رویہ عمارتوں میں کفر و شرک کا بسیرا تھا، اور جس کے بسنے والے انسان شرافت و متانت کو بزورِ شمشیر زیر کر کے سات سو برس کا سفر طے کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں لات پرستی شرافت کا منہ چڑا کر اُسے عہدِ رفتہ کی جہالت سے تعبیر کرتی ہے۔

قرطبہ کی ابتدائی آبادی سے گذر کر ہم کچھ اور آگے چلے تو سامنے ایک دریا اور اُس پر بنا ہوا پُل نظر آیا۔ یہ قرطبہ کا مشہور دریا "وادی الکبیر" تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بوسیدہ فصیل نظر آ رہی تھی جو یقیناً کبھی قرطبہ کی شہر پناہ رہی ہوگی۔ پُل عبور کرنے کے بعد ہم باقاعدہ شہر میں داخل ہو گئے۔ ہم نے غرناطہ سے روانہ ہوتے وقت ہوٹل لز کے استقبالیہ سے قرطبہ کے ایک اچھے ہوٹل کا پتہ معلوم کر لیا تھا، اس کے مطابق ہم کسی دقت کے بغیر اس بارہ منزلہ ہوٹل کے گیٹ پر پہنچ گئے جس کا نام ہوٹل میلِ تھا۔ یہ قرطبہ کا مشہور ترین ہوٹل تھا، اور جب ہم اس کمرے میں پہنچے جس میں ہمیں ٹھہرنا تھا تو اندازہ ہوا کہ اس کا معیار غرناطہ کے ہوٹل لز سے کافی بہتر تھا۔

جب ہم اپنے ہوٹل پہنچے تو تقریباً پونے دو بجے کا عمل ہوگا۔ ہوٹل کے استقبالیہ سے معلوم ہوا کہ جامع قرطبہ ۴ بجے سیاحوں کیلئے کھلتی ہے، چنانچہ ہم نے نماز ظہر ادا کی۔ ریستوران میں کھانا کھایا۔ مغربی ملکوں میں جہاں حلال گوشت میسر نہ ہو، وہاں اُبلی ہوئی مچھلی سب سے بہتر غذا ہوتی ہے، چنانچہ وادی الکبیر کی صاف ستھری اور تازہ مچھلی نے کام و دہن کی خوب خوب تواضع کی۔

کھانے کے بعد ہم نے ایک ٹیکسی لی، اور جامع قرطبہ روانہ ہو گئے۔ ٹیکسی پیچ در پیچ سڑکوں اور محلوں سے ہوتی ہوئی ایک طویل و عریض قلعہ نما عمارت کے سامنے رُک گئی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہی مسجد قرطبہ ہے۔ ہمارے سامنے مضبوط پتھر کی بنی ہوئی ایک پُرشکوہ، بلند و بالا اور طویل عمارت تھی جس کی دیوار کو زمین پر بنے ہوئے بڑے بڑے پشتوں نے سہارا دیا ہوا تھا۔

(باقی آئندہ)

نفح الطیب ص ۱۰ ج ۲ ۔۔۔

مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری
مقیم مدینہ منورہ

حج کی فرضیت
اور اسکی ادائیگی میں اہل استطاعت کی غفلت

اسلام کے پانچ ارکان میں سے حج بیت اللہ بھی ہے اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (سورۂ آل عمران)

اور اللہ کے لئے ان لوگوں پر بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے جسے وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو اور جو شخص کفر اختیار کرے۔ اللہ بے نیاز ہے سارے جہاں سے۔

اس آیت شریفہ میں حج بیت اللہ کو فرض قرار دیا ہے اور جن لوگوں پر فرض ہے ان کا ذکر بھی فرما دیا ہے یعنی من استطاع الیہ سبیلا فرما کر یہ ارشاد فرما دیا ہے کہ حج بیت اللہ ان لوگوں پر فرض ہے جن کو بیت اللہ تک پہنچنے کی استطاعت ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ استطاعت سے کیا مراد ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ زاد و راحلة یعنی آنے جانے کا سفر خرچ اور سواری کا انتظام ہونا۔ لہٰذا جو شخص اتنی استطاعت رکھتا ہو کہ مکہ معظمہ تک اپنے خرچ سے یا اپنی ذاتی یا کرایہ کی سواری سے آجا سکتا ہو۔ اس پر حج فرض ہے جہاں حج کی بہت سی فضیلتیں وارد ہوئی ہیں وہاں حج نہ کرنے پر وعیدیں بھی آئی ہیں۔
حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

من لم تحبسه حاجة ظاهرة او مرض حابس او سلطان جائر ولم یحج فلیمت ان شاء یهودیا وان شاء نصرانیا۔

(الترغیب والترھیب)

جسے کسی مجبوری نے یا روکنے والے مرض نے یا ظالم بادشاہ نے نہیں روکا اور اس نے حج نہیں کیا تو وہ چاہے تو یہودی ہونے کی حالت میں مر جائے اگر چاہے تو نصرانی ہونے کی حالت میں مر جائے ۔

حدیث کے مضمون کی طرف آیت شریفہ کے سیاق سے بھی تائید ہوتی ہے کیونکہ حج کی فرضیت بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا ہے ۔ ومن کفر فان الله غنی عن العلمین کہ جو شخص کفر اختیار کرے تو بلاشبہ اللہ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے اس میں جو لفظ کفر فرمایا ہے ۔ اس سے کفر کے معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں اور یہ اس صورت میں ہے جبکہ حج کی فرضیت کا منکر ہو اور ناشکری کے معنی بھی ہو سکتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوگا ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جب مال دیا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق خرچ نہ کرے یہ کتنی بڑی ناشکری ہے ۔

کثیر تعداد میں ایسے لوگ ہیں جن پر استطاعت کی وجہ سے حج فرض ہے لیکن وہ دنیاوی مشاغل کی وجہ سے حج نہیں کرتے ، نفس اور شیطان ان کو یہ سمجھاتے رہتے ہیں کہ ابھی بڑی زندگی پڑی ہے کر لیں گے دو چار سال بعد کر لینا ابھی کیا جلدی ہے حالانکہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ۔

من اراد الحج فلیعجل ۔ (جسے حج کرنا ہو وہ جلدی کرے) ایسا اکثر ہوتا ہے کہ آئندہ آنے والے برسوں پر حج کو ٹالنے والے بغیر حج کئے مر جاتے ہیں اور ترک حج کی وعید کے مستحق ہوتے ہیں ان میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حج بدل کی وصیت کر جاتے ہیں لیکن اول تو یہ ناسمجھی کی بات ہے کہ خود طاقت اور استطاعت ہوتے ہوئے حج سے محروم رہیں ۔ دوسرے حج بدل کا معاملہ وارثوں کے سپرد ہو جاتا ہے ۔ پھر وصیت صرف تہائی مال میں نافذ ہو سکتی ہے ۔ تہائی مال میں حج ہو سکے یا نہ ہو سکے یہ مستقل غور کرنے کی چیز ہے ۔ تیسری بات یہ ہے کہ وصیت نافذ کرنے کا معاملہ وارثوں پر چلا گیا اب وہ وصیت نافذ کریں یا نہ کریں اس کا بھی احتمال رہتا ہے اور ایسا ثابت ہوتا ہے کہ ورثاء وصیت کو نافذ نہیں کرتے ۔

لہٰذا ہر اس شخص پر لازم ہے جو صاحب استطاعت ہے جلد سے جلد حج کرے کچھ لوگ حج سے اس لئے محروم رہ جاتے ہیں کہ حج کے اخراجات جو حاجیوں سے سنتے ہیں وہ اپنے پاس نہیں پاتے حالانکہ وہ حج کے خرچے نہیں ہوتے ۔ قرآن وحدیث کی تصریح کے مطابق جسے بیت اللہ تک پہنچنے کا مقدور ہو اس پر حج فرض ہے ۔ یہ جو سوچا جاتا ہے کرتے

بیٹوں کے لئے گھڑیاں لانی ہیں اور اتنے دامادوں کے لئے ٹیپ ریکارڈر لانا ہے اور واپس آکر خاندان والوں کی دعوتیں بھی کرنی ہیں اس میں جو ہزاروں خرچ ہوتے ہیں اور حرمین شریفین کے بازاروں میں جو کپڑوں کے تھان خریدے جاتے ہیں اور طرح طرح کی مشینیں ہمراہ لائی جاتی ہیں ان اخراجات کو بھی حج کا خرچ سمجھتے ہیں اور جب تک اتنے خرچ کا ارادہ نہ ہو اس وقت تک حج سے رُکے رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب فالتو چیزیں ہیں اور بہت سے لوگ تو ٹی وی اور وی سی آر خرید کر لاتے ہیں اور گھر والوں کو گناہوں میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں گئے تھے نیکی کمانے اور الٹے خود اپنے آپ کو اور آل اولاد کو گناہگاری کی زندگی پر ڈالنے والا عمل کر بیٹھتے ہیں۔

حج کی طرح عمرہ بھی ایک عبادت ہے اور وہ بھی مکہ معظمہ ہی میں ادا ہو سکتا ہے حج اور عمرہ کے بارے میں حضور پر نور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

تابعوا بین الحج والعمرۃ فانھما ینفیان الفقر والذنوب کما ینفی الکیر خبث الحدید و الذھب والفضۃ۔	حج و عمرہ یکے بعد دیگرا ادا کیا کرو کیونکہ وہ دونوں تنگدستی اور گناہوں کو دور کرتی ہیں جیسے بھٹی لوہے اور سونے چاندی کے میل کچیل کو دور کرتی ہے۔

(رواہ الترمذی)

صاحب استطاعت پر زندگی میں ایک بار حج کرنا فرض ہے اور عمرہ کرنا سنت موکدہ ہے جب حج کو جاتے ہیں عمرہ بھی اس سے پہلے یا بعد میں ادا ہو جاتا ہے۔

جب سے اللہ تعالیٰ نے مالی وسعت دی ہے ہزاروں مسلمان مرد، عورت، بوڑھے اور جوان عمرہ ادا کرنے کے لئے سفر کرتے ہیں۔ عمرہ کا سفر تو مبارک ہے اور بہت بڑی سعادت ہے، لیکن ایک بہت ضروری بات لائق تنبیہ ہے اور وہ یہ کہ بہت سے لوگ جب عمرہ کر لیتے ہیں تو حج نہیں کرتے وہ سمجھتے ہیں کہ حرمین شریفین ہو آئے بیت اللہ شریف کی زیارت کر لی روضہ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) پر سلام پڑھ آئے مسجد نبوی میں چالیس نمازیں پوری کر لیں لہٰذا اب سفر حج کی ضرورت نہیں رہی، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ عمرہ کرنے سے حج کی فرضیت ساقط نہیں ہو جاتی حج بدستور فرض رہتا ہے اگر عمرہ کر کے صاحب استطاعت ہوتے ہوئے حج نہ کیا اور مر گئے تو ترک حج کا گناہ کبیرہ ہو گا۔ حدیث شریف میں جو وعید آئی ہے وہ اوپر گزر چکی ہے۔

ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عمرہ میں تو دس ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں اور حج میں اس کی دو تین گنی رقم خرچ ہوتی ہے ہم نے عمرہ کر لیا ہے آگے رقم نہیں ہے جو حج کر سکیں پہلی بات تو یہ ہے کہ جس نے دس ہزار خرچ کر دئے عموماً ایسا شخص

حج کے لئے رقم خرچ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ خاندان کے کئی افراد عمرہ کے لئے آجاتے ہیں اس رقم سے دو تین افراد کا حج ادا ہو سکتا ہے حج رہ جاتا ہے اور ایک بڑے میاں اور تین چار لڑکے عمرہ کر کے چلے جاتے ہیں۔ حج کی استطاعت ہوتے ہوئے حج نہ کرنا اور عمرہ پر رقم خرچ کر کے ادائیگی حج سے لاپرواہ ہو جانا غلط طریقۂ کار ہے۔

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے پاس دس پندرہ ہزار روپیہ ہوتا ہے وہ اسے عمرہ پر خرچ کر دیتے ہیں کمانے والے لوگ ہوتے ہیں پیسے آتے رہتے ہیں اگر سال دو سال انتظار کرلیں اور عمرہ کرنے میں جلدی نہ کریں تو یہی رقم حج کرنے میں کام آسکتی ہے اور عمرہ بھی ادا ہو جائے گا۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مال کثیر ہوتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ ہم پر حج فرض ہے گرمی کی وجہ سے یا حج کی بھیڑ کیوجہ سے حج فرض کیلئے نہیں آتے اور عمرہ کر کے اپنے نفس کو سمجھالیتے ہیں کہ ہم حرمین شریفین ہو آئے لہٰذا حج کے لئے جانے کی چنداں ضرورت نہیں یہ بہت بڑی غلطی ہے اور فرض چھوڑنے کی جسارت ہے تکلیف تو سفر میں ہوتی ہی ہے ساری زندگی سردی وگرمی میں گزرتی ہے دنیا کے سب کام آخر انجام دیتے ہی ہیں بھیڑ اور گرمی کا سوال صرف حج کے بارے میں سامنے آگیا۔ کل چالیس دن کا تو سفر ہوتا ہی ہے اس میں شہر مکہ یا مدینہ میں رہتے ہیں صرف ۴ - ۵ دن ایسے ہوتے ہیں جو منیٰ اور عرفات میں گزارنے پڑتے ہیں چار پانچ دن کی تکلیف کو سامنے رکھکر بغیر حج کئے مرجاتا ہے جس کیلئے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہودی ہو کر مرجائے یا نصرانی ہو کر مرجائے کتنی بڑی بدبختی ہے۔

یہ چند صفحات مشاہدات وتجربات کے بعد لکھے گئے ہیں تمام دینی رسالوں کے ذمہ داروں سے درخواست ہے کہ اس کو شائع فرمائیں اگر کوئی صاحب کتابچہ کی صورت میں شائع فرمائیں تو انشاء اللہ اجر عظیم کے مستحق ہوں گے۔ حضرات مقررین اور خطباء کرام بھی اپنے بیان میں اس پر توجہ فرمائیں۔

ترتیب :- مولانا محمد ابراہیم صاحب، خطیب سیالکوٹی (مقیم انگلینڈ)

ملفوظات حضرت مولینا محمد ادریس صاحب کاندھلوی

رحمۃ اللہ علیہ

قسط اوّل

ارشاد فرمایا۔۔۔۔ اچھا مولوی صاحب، پند نامہ عطار میں ایک شعر ہے کہ

نفس و شیطان زد کریما راہِ من ۔۔۔ میں نے عرض کیا۔ ہاں حضرت ہے۔ فرمایا اچھا، تو بتا اس سے آگے کیا ہے؟ میں نے عرض کیا۔۔۔ رحمتت باشد شفاعت خواہ من۔

فرمایا اچھا بتا نفس کو مقدم کیوں کیا اور شیطان کو مؤخر کیوں کیا؟ ۔۔۔۔۔۔

عرض کیا کہ حضرت مجھے معلوم نہیں صرف ترجمہ ہی آتا ہے۔ اسرار و رموز اور معارف و حقائق سے میں بے خبر ہوں ۔۔۔۔ فرمایا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے فرمایا کہ نفس بدون شیطان سب کچھ کر سکتا ہے۔ مگر شیطان بغیر نفس کے تعاون کے کچھ نہیں کر سکتا مزید فرمایا، مولوی صاحب شیطان کو بھی تو نفس نے ہی شیطنت پر ابھارا۔ اس کو ورغلانے اور بہکانے والا کوئی دوسرا شیطان تو نہ تھا۔

ارشاد فرمایا، مولوی صاحب تو کبھی ہمارے حضرت مولینا انور شاہ صاحب کو دیکھ لیتا تو حضرت حافظ بدرالدین عینیؒ اور حافظ ابن حجر عسقلانی یاد آجاتے۔ اور اگر حضرت مولینا اشرف علی صاحب کو دیکھتا تو شیخ اکبرؒ کی یاد تازہ ہو جاتی ۔۔۔۔ پھر فرمایا اچھا مولوی صاحب تو نے ہمارے حضرت مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی کو دیکھا میں نے عرض کیا۔ میں نے تو ان کا نام ان کے فوت ہونے سے کئی سال بعد سنا۔ فرمایا، مولوی صاحب تو اگر ان کو دیکھ لیتا تو تجھ پر امام غزالی اور امام رازی کے علوم

منکشف ہو جاتے ۔ اپنے اخلاص و محبت سے لبریز لہجے میں فرمایا ۔ درویش تو نے کچھ بھی نہیں دیکھا تو تو دنیا میں یوں ہی چلا آیا اور یوں ہی چلا جائے گا ۔۔۔۔ اچھا صاحب تو نے کیا دیکھا؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت ان اکابر کے بارے میں کچھ کچھ اندازہ ہوگیا ۔ فرمایا ۔ مولوی صاحب تمہیں کہاں سے اندازہ ہوگیا ۔۔۔۔ عرض کیا کہ حضرت والا حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ قاری محمد طیب صاحب اور حضرت مولینا محمد یوسف صاحب بنوری کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحبؒ اور دیگر اکابر کتنے بڑے ہوں گے جن کو آپ حضرات اپنا بڑا مانتے ہیں، تو حضرت والا خاموش ہو گئے ۔۔۔۔

ارشاد فرمایا ۔ مولوی صاحب! یہ جو ائمہ مساجد ہیں ۔ مجھے اُن پر رشک آدے ہے ۔۔۔۔ میں نے عرض کیا حضرت کیوں؟ فرمایا درویش ! یہ لوگ چوبیس گھنٹے اللہ کے گھر میں رہتے ہیں تکبیر اُولیٰ ان کو نصیب ہوتی ہے ہر نماز میں ۔ اور مولوی صاحب ! یہ لوگ اللہ کا کلام معصوم بچوں کو پڑھاتے ہیں ۔ اچھا صاحب ! خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ کے مصداق ہیں ۔ مولوی صاحب، میرا کبھی کبھی جی چاہتا ہے ۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی چھوٹی سی مسجد کا امام بن جاؤں ۔۔۔۔ میں نے عرض کیا ۔۔۔ حضرت پھر بخاری کون پڑھائے گا؟ فرمایا مولوی صاحب ! بخاری کا کیا ہے ؟ ۔۔۔ بہت ہیں پڑھانے والے، اچھا صاحب ، پھر میں نے عرض کیا ۔ حضرت آپ تو امام گر ہیں ۔ چہرے پر میں نے تکدر اور تغیر کا اثر محسوس کیا ۔ حضرت والا نے میرے جواب میں فرمایا ، مولوی صاحب ! ۔۔۔۔ میں گر ور کچھ نہیں ہوں اچھا صاحب ، گرور کچھ نہیں ہوں ، میں امام گرور کچھ نہیں؛ بس خالی اور بس ہوں اچھا صاحب؛ میں خاموش ہوگیا ۔۔۔۔

ارشاد فرمایا ۔ مولوی صاحب ، ایک بار عمر نحوی نے جار اللہ زمخشری کے مکان پر دستک دی ۔ زمخشری اندر سے بولے ، "من ؟ (کون) اس نے کہا عمر ۔ مولوی صاحب مسئلہ ہے کہ ایسے موقع پر اپنے آپ کو متعارف کراؤ ، ایسے موقع پر ناقص تعارف کبر و نخوت کی علامت ہے ۔ تو زمخشری نے کہا ۔ اِنصرِف (واپس جا) وہ نحوی تھا ۔ اس نے کہا عمر لا ینصرف تو زمخشری فوراً بولا کہ اذا نُکِّرَ صُرِفَ ۔ اچھا صاحب گفتگو بھی ہو رہی تھی اور نحو کے قواعد بھی بیان ہو رہے تھے ۔۔۔۔

ارشاد فرمایا ۔ مولوی صاحب تم اور تمہارے ساتھی بخاری کے سبق کے بارے میں کیا کہیں؟ اصرار سے معلوم کرنا چاہا ، آخر میں نے مجبوراً بادل ناخواستہ صاف صاف عرض کیا کہ حضرت بہت سے ساتھی کچھ شاکی اور کچھ حاکی ہیں ۔ کہ حضرت والا اکابر اُمت اور ائمہ فنون کی آراء سامنے

لا کے رکھ دیتے ہیں مگر محاکمہ قائم نہیں فرماتے ۔ ہم پریشان ہو جاتے ہیں کہ کس کس کو یاد کریں اور کس کس کو بھول جائیں بہت خوش ہو کر فرمایا ۔ مولوی صاحب یہ تو بہت اچھی بات ہے مولوی صاحب میری حیثیت تم میں حدِ اوسط کی ہے جو صغریٰ کا تعلق کبریٰ سے قائم کرنے کے بعد خود ساقط ہو جاتی ہے ۔ مولوی صاحب میں تمہارا تعلق اکابر سے قائم کر دیتا ہوں اب تم جانو اور تمہارا کام ! اچھا صاحب' مولوی صاحب اپنے علم پر تو خود مجھے بھروسہ نہیں، تمہیں کیا بتاؤں اور ان اکابر پر تو صدیوں سے امت اعتماد کرتی چلی آرہی ہے ۔

ارشاد : ——— مولوی صاحب امام غزالی و رازی کہتے ہیں ۔ ایمان نام ہے جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا وہ سب کچھ مان لینا ، تصدیق کرنا ——— اچھا مولوی صاحب ! تو بتا یہ کونسا قضیہ ہے ۔ میرے منہ سے نکل گیا موجبہ کلیہ فرمایا تو بتا اس کا نقیض کیا ہے ؟ ——— عرض کیا سالبہ جزئیہ فرمایا کیا مطلب ؟ ——— میں نے عرض کیا کسی ایک کا انکار کرنا یہ کفر ہوا ، فرمایا درویش تونے منطق کہاں تک پڑھی ؟ ——— میں نے گھبرا کر عرض کیا سلم تک مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ حضرت والا میرا امتحان لینے لگے تو میں تو بالکل صفر اور فیل ہوں اور یہ تو اتفاقاً صحیح جواب میرے منہ سے نکل گیا ۔ حضرت والا نے میری پریشانی بھانپ کر فرمایا نہایت شفقت بھرے لہجے میں' بس مولوی صاحب، سلم تک پڑھی ۔ درویش مناظر تو اوپر تھے اور تو سیڑھی پر رہ گیا ۔

ارشاد : ——— ہمارے استاذ حضرت مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی فرمایا کرتے تھے ۔ اصول فقہ ایمان والوں کی منطق و فلسفہ ہے ۔ اسے خوب پڑھو اور خوب سمجھ کر پڑھو ۔ مولانا روم کا شعر بھی پڑھتے تھے ۔

چند خوانی حکمت یونانیاں
حکمت ایمانیاں را ہم بخواں

ارشاد : ——— مولوی صاحب تم مجھ سے بخاری پڑھ رہے ہو اور تمہارے ساتھی بھی میرے خیال میں تم سمجھ گئے ہو کہ تم لوگ مجتہد نہیں بن سکتے ۔ پھر زور دے کر فرمایا مولوی صاحب تم تو مجتہد کیا ہو گے تمہارا پڑھانے والا مجتہد نہیں بن سکتا ۔

ایک بار فرمایا آدمی کے احمق ہونے کی آجکل پہچان یہ ہے کہ ائمہ مجتہدین رحمھم اللہ علیہم اجمعین سے بدگمان ہو کر کسی کی تقلید نہ کرے مزید برآن ان کی شان میں بدگمان ہو کر بد زبان ہو جانے ۔ مولوی صاحب مقلد رہیو غیر مقلد نہ ہو جائیو ۔

ارشاد : ——— میں ایک بار اپنے دونوں بیٹوں محمد اسحٰق سلمہ اور محمد ادریس سلمہ کو لیکر حاضر

خدمت ہوا (اس وقت دونوں قرآن کریم حفظ کر رہے تھے) عرض کیا کہ حضرت! یہ میرے بڑے لڑکے محمد اسحٰق اور یہ میرے چھوٹے لڑکے محمد ادریس ہیں حضرت والا ان کے سر پر دست شفقت پھیر کر ان کے حق میں دعا خیر فرما دیں۔ حضرت والا! دونوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر اللہ کے حضور دست بدعا ہوئے۔ بعد میں فرمایا اچھا درویش! محمد اسحٰق سے مناسبت محمد یعقوب کی ہو وے تو نے محمد ادریس کیوں نام رکھا چھوٹے کا۔ جواباً عرض کیا۔ بڑے کا نام میرے ابا نے محمد اسحٰق رکھا اور چھوٹے کا نام میں نے حضرت والا سے محبت و عقیدت کی بنا پر محمد ادریس رکھا۔ پھر یہ بھی خیال تھا بھائی بھائی تو ہیں کون سے باپ بیٹے ہیں آخر دونوں نام حضرات انبیاء معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ہیں۔

محمد عمران اشرف عثمانی

احوالِ جامعہ

۶ر شوال بروز بدھ سے اس سال درس نظامی کی تمام جماعتوں کے داخلے شروع ہوئے جو بحمداللہ اب تک جاری ہیں، اب تک تقریباً ۴۰۰ طلبہ کے داخلے کی کارروائی مکمل ہو چکی ہے جبکہ ابھی داخلے جاری ہیں۔

تقریبِ افتتاحِ بخاری

الحمدللہ اس سال ۱۶ر شوال سے جامعہ دارالعلوم کے نئے تعلیمی سال کا افتتاح ہوا کیونکہ اسی روز صبح کو مسجد میں افتتاحِ بخاری کی ایک سادہ سی تقریب منعقد ہوئی۔

اس تقریب کا آغاز قاری عبدالرشید صاحب (استاذ تجوید دارالعلوم کراچی) کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا، اس کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا سبحان محمود صاحب مدظلہم نے طلبۂ دارالعلوم کو تعلیم کے متعلق نصائح سے نوازا۔

ان کے بعد دارالعلوم کراچی کے صدر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم نے طلبۂ دارالعلوم سے خطاب فرمایا، جس میں طلبہ کو ضروری نصائح اور ہدایات سے نوازا۔ اس کے بعد حضرت شیخ الحدیث مدظلہم نے اختتامی دعا فرمائی۔ اور یوں دارالعلوم کراچی کے نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو گیا۔

البلاغ انگریزی

الحمدللہ اس ماہ جامعہ دارالعلوم کراچی کی جانب سے ایک انگریزی رسالہ "البلاغ انٹرنیشنل" کا اجراء کیا گیا، یہ ذی القعدہ کا شمارہ ۳۲ صفحات پر مشتمل نہایت جامعیت کا حامل ہے اس کا سرورق انتہائی پروقار اور غیر ضروری تصنع سے دور ہے جس میں ایک نیلگو آسمان کے مابین ایک سورج کے طلوع کا منظر دکھایا گیا ہے۔

اس ماہ کے رسالہ میں ۷ مضامین ہیں، جن میں سے بعض سلسلہ وار تفسیر اور فقہ سے متعلق ہیں، اس کے علاوہ ابتدائی تعارف، معارف القرآن کا انگلش ترجمہ، حجیت حدیث پر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی کا سیر حاصل مضمون، قارئین کے سوال و جوابات حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کا ایک اور مضمون "نماز سنت کے مطابق پڑھئے" اور مولانا محمد ولی رازی صاحب، مدظلہم کا مضمون "عیسائیت کی حقیقی تصویر" اور حضرت تھانویؒ کے کچھ اقوالِ زریں پر مشتمل ہے۔ جو حضرات اسے حاصل کرنا چاہیں وہ "دفترِ البلاغ انگریزی جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴ کے پتہ سے طلب کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس سال دارالعلوم کراچی کے اساتذہ میں ایک نئے جوہر کا اضافہ ہوا اور وہ حضرت مولانا محمود اشرف عثمانی صاحب ہیں جو مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کے سب سے بڑے پوتے یعنی جناب مولانا ذکی کیفی صاحب رحمۃ اللہ کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں جنہوں نے فراغت جامعہ اشرفیہ لاہور سے حاصل کی تھی اس کے بعد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کی حیات میں ان کے زیرِ سایہ درجہ تخصص دارالعلوم کراچی سے کیا، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں بھی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد سے وہ لاہور میں جامعہ اشرفیہ میں تقریباً بیس برس سے استاذ تھے، جہاں آپ کافی عرصے سے مشکوٰۃ شریف اور اس درجہ کی مختلف کتابیں پڑھا رہے تھے، اب الحمدللہ بزرگوں کے مشورے سے وہ لاہور سے کراچی منتقل ہوگئے ہیں اور اس سال سے ان شاء اللہ دارالعلوم کراچی میں پڑھائیں گے۔

(۱) ــــ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۵۵ وصیتیں

جمع و ترتیب : شیخ حمزہ محمد صالح عجاج

صفحات : ــــ ۱۰۱

(۲) ــــ نصیحتیں اور وصیتیں

تالیف : محدث جلیل شیخ حسن بن محمد المشاط

صفحات : ــــ ۶۹

(۳) ــــ راہ ہدایت و عمل

ترتیب : شیخ احمد عزالدین البیانونی

صفحات : ــــ ۴۲

(۴) ــــ غیرت مند مومن باپ کے نام

تالیف : شیخ عبداللہ ناصح علوان

صفحات : ــــ ۶۱

چاروں رسائل کا عربی سے اردو ترجمہ : مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار صاحب حفظہ اللہ
رئیس مجلس دعوت و تحقیق اسلامی کراچی، نائب رئیس جامعہ علوم اسلامیہ
کراچی ۵

سائز : ۳۰×۲۰
ناشر : دار التصنیف جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی ۵

زیر تبصرہ چاروں رسائل عرب کے نامور جلیل القدر علما کے تالیف کردہ ہیں ان تمام رسائل کا عربی سے شستہ اردو میں ترجمہ مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار صاحب مدظلہم استاذ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن نے کیا ہے۔

مولانا حبیب اللہ صاحب مدظلہم ملک کے ان چیدہ علما میں سے ہیں جنہوں نے عربی و اسلامی فنون کی تدریس کیساتھ تصنیف و تالیف کے ذریعہ بھی گرانقدر دینی خدمات انجام دی ہیں "کشف النقاب عمایقولہ الترمذی وفی الباب"۔ جیسی وقیع علمی کتاب جو متعدد ضخیم جلدوں میں ہے آپ ہی کے قلم کا شاہکار ہے۔

مولانا نے عرب علما کی اہم اور مفید کتابوں اور رسائل کے اردو ترجمہ کا گرانقدر سلسلہ شروع کر رکھا ہے جس کے نتیجہ اردو بولنے والے طبقہ کے لئے ان کی کتابوں سے استفادہ آسان ہوگیا ہے، ترجمہ کرنے میں مولانا نے ایسی کتابوں اور رسائل کو ترجیح دی ہے۔ جو عام فہم اور عامۃ الناس کے فائدہ کے ہوں اور باریک علمی مباحث پر مشتمل نہ ہوں، اس قسم کے متعدد کتب و رسائل آپ کے سلیس اور شستہ ترجمہ کے بعد زیور طبع سے آراستہ ہو کر سامنے آچکے ہیں " اسلام اور تربیت اولاد " مسلمان بچے اور فرنگی تعلیم گاہیں" اصلاح معاشرہ اور اسلام " وغیرہ زیر تبصرہ چار رسائل اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۵۵ وصیتیں" یہ رسالہ شیخ حمزہ محمد صالح عجاج کی تالیف ہے۔ فاضل مؤلف نے اس رسالہ میں مستند کتب حدیث صحیح بخاری صحیح مسلم، سنن ابی داؤد۔ الترغیب و الترہیب اور ریاض الصالحین وغیرہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی پچپن وصیتیں منتخب کرکے جمع کی ہیں جو آپ نے مختلف حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کی تھیں، یہ وصیتیں توحید باری تعالیٰ، طلب علم وغیرہ متعدد اہم موضوعات سے متعلق ہیں، متعدد وصایا کے ساتھ بعض دوسری احادیث بھی موضوع کیساتھ مناسبت ملحوظ رکھتے ہوئے تکثیر فائدہ کے لئے ذکر کی گئی ہیں۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اگرچہ ان وصایا کے اولین مخاطب تھے لیکن یہ ہمارے لئے بھی مشعل راہ اور حرز جاں بنانے کے قابل ہیں۔

نصیحتیں اور وصیتیں

یہ رسالہ مکہ مکرمہ کے مشہور محدث شیخ حسن بن محمد المشاط رحمۃ اللہ علیہ (جو آخری زمانہ میں حدیث میں علو اسناد کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے تھے) کی تالیف ہے، انہوں نے اپنے متعلقین، تلامذہ اور طلبۂ علم کے لئے کچھ نصیحتیں اور وصیتیں ترتیب دی تھیں، ایک اللہ والے کی یہ نصائح اور وصایا جو ذکر الٰہی، حقوق العباد، حقوق اللہ، فرائض و نوافل اور دن و رات کی ادعیہ اور اذکار سے متعلق ہیں ہر مومن کے لئے نافع ہیں کتاب کے آخر میں جمعہ کی فضیلت و آداب کا بیان ہے یہ مختصر سا کتابچہ اور بھی متعدد فوائد پر مشتمل ہے۔

راہ ہدایت و عمل

یہ رسالہ شیخ احمد عزالدین البیانونی کا تالیف کردہ ہے اور اسم بامسمی ہے اس میں مؤلف نے شروع میں دینی اعتبار سے ہمارے معاشرہ کے بڑے بڑے امراض کی طرف توجہ دلائی ہے مثلاً: "اسلام سے ناواقفیت" ایمان کی کمزوری، اندھی تقلید۔ عورتوں کا فتنہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک کر دینا، وغیرہ اس کے بعد فاضل مؤلف نے طہارت، نماز، صدقات، روزہ، حج، جہاد، تلاوت، قرآن کریم، ذکر، دعا، خرید و فروخت، نکاح، لباس، کھانے پینے، صلۂ رحمی اور آداب اخلاق سے متعلق اہم اہم احکامات اور نصائح کو سہل اور مؤثر انداز میں اختصار کیساتھ نمبروار ذکر کیا ہے۔ ان نصائح و احکام کی مجموعی تعداد تین سو اسّی ہے، یہ تمام وہ احکام و نصائح ہیں جن پر عمل کرنا باعث اجر اور اخروی اور دنیوی کامیابی کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ زیادہ سے زیادہ افراد کو اس رسالہ سے فائدہ پہنچائیں۔

غیرت مند مومن باپ کے نام

:- یہ رسالہ شیخ عبداللہ ناصح علوان کی تالیف ہے جو "اسلام اور تربیت اولاد" جیسی مفید اور ضخیم کتاب کے بھی مؤلف ہیں۔

اس رسالہ میں فاضل مؤلف نے اولاد اور اہل و عیال سے متعلق غیرت مند مومن باپ کی ذمہ داریوں کو بیان کیا ہے اور بتلایا ہے کہ معاشرہ میں بے حیائی، عریانی، آوارگی اور مرد و زن کے بے محابانہ اختلاط کا جو سیلاب آیا ہوا ہے اس کی بڑی وجہ والدین کی بے توجہی اور اپنے تربیتی فریضہ سے ان کی مجرمانہ غفلت ہے، مؤلف نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ ہر مسلمان اپنے گھر کا ذمہ دار ہے اس سے اس کے گھر کے افراد کے بارے میں پوچھا جائے گا اور ان کی بے اعتدالی اور بے دینی کے بارے میں بازپرس ہوگی۔

اللہ تعالیٰ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں بالخصوص والدین کو اس کے پڑھنے اور اس کی ہدایات کے مطابق اپنے گھر والوں اور اپنی اولاد کی صحیح تربیت کرنے کی توفیق دے۔

چاروں رسائل کا کاغذ اور ان کی کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ (ر۔ا۔س)

خطرناک غلطیاں

- دوسروں کی موت دیکھتے ہوئے اپنے آپ کو اس سے بری سمجھنا۔
- اس خیال میں گم رہنا کہ میں ہمیشہ تندرست اور خوبصورت رہوں گا۔
- اس نیت سے برا کام کرنا کہ صرف دو چار مرتبہ کر کے چھوڑ دوں گا۔
- کوئی کام ادھورا چھوڑ کر اسے کسی اور وقت میں پورا کرنے کی امید کرنا۔
- جو کام خود سے نہ ہو سکے تو وہ اوروں کے لئے بھی ناممکن خیال کرنا۔
- ادائیگی قرض کے متعلق ذرائع آمدنی کا تصور باندھ کر غیر ضروری اخراجات کے لئے بے دھڑک قرض لینا
- دوسروں کا دل دکھانا اور خود اس سے بھلے کی امید رکھنا۔

محمد نسیم - پی - آئی - سی - ایچ - ایس - کراچی

"البلاغ انٹرنیشنل"

پہلے شمارہ کی اشاعت

مقام مسرت ہے کہ الحمد للہ جامعہ دارالعلوم کراچی کے انگریزی ماہنامہ جریدہ "البلاغ انٹرنیشنل" کی اشاعت عمل میں آچکی ہے۔

اس شمارہ میں کئی سلسلہ وار مضامین کیساتھ

- ابتدائی تعارف
- تفسیر معارف القرآن (انگریزی ترجمہ)
- "وحی کی حقیقت" پر حضرت جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کا سیر حاصل مضمون
- حجیت حدیث پر مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی کا ایک جامع مقالہ۔
- قارئین کے سوال، جوابات
- "نماز سنت کے مطابق پڑھیں" نہایت مفید مضمون۔
- جناب مولانا محمد ولی رازی صاحب مدظلہ کا عیسائیت پر جامع مقالہ "عیسائیت کی حقیقی تصویر"۔

اس کے علاوہ حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے اقوال ذریں پر مشتمل یہ ابتدائی شمارہ ملاحظہ فرمائیں۔

حسن و وقار سے مرصع ٹائیٹل اور عمدہ کاغذ کا حامل یہ جریدہ مندرجہ ذیل قیمتوں پر دستیاب ہے۔

ملکی خریداروں کے لئے:

فی پرچہ: ۱۳ر روپے

سالانہ: ۱۵۰ر روپے

غیر ملکی خریداروں کیلئے: فی پرچہ ۲ امریکی ڈالر

① امریکہ۔ کینیڈا۔ آسٹریلیا۔ نیوزی لینڈ۔ ساؤتھ افریقہ ۲۴ر ڈالر یا اس کے برابر پاکستانی روپے

② ایشیا، یورپ اور افریقہ (علاوہ ساؤتھ افریقہ) ۲۰ر ڈالر یا اس کے برابر پاکستانی روپے

③ انڈیا۔ بنگلہ دیش، ۱۵ر ڈالر یا اس کے برابر پاکستانی روپے

مزید تفصیلات کیلئے رابطہ کیجیے

منیر احمد خان، ناظم شعبہ البلاغ انٹرنیشنل

دارالعلوم کراچی، پوسٹ کوڈ 75180

فون: 311217 فیکس نمبر 313535

براہ مہربانی چیک/ڈرافٹ اس پتہ پر روانہ فرمائیں۔

البلاغ انٹرنیشنل

دارالعلوم کراچی

پوسٹ کوڈ 75180

قارئین البلاغ توجہ فرمائیں

اکثر قارئین البلاغ کی مدت خریداری ماہ ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ پر ختم ہو رہی ہے ان حضرات سے درخواست کیجاتی ہے کہ وہ ۱۴۱۱ھ کے لئے سالانہ چندہ ابھی روانہ نہ فرمائیں ۔ سالانہ چندہ کا اعلان ماہ ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ کے شمارے میں کیا جائے گا ۔ کاغذ کی ہوشربا گرانی اور دوسری چیزوں میں مزید اضافہ مثلاً کاتب حضرات کی اجرتیں پرنٹنگ کے خرچ میں مزید اضافہ کی وجہ سے البلاغ کی قیمت میں اضافہ کیا جارہا ہے یہ اضافہ وفاقی اور صوبائی بجٹ آنے کے بعد کیا جائے گا ۔ بجٹ میں خطرناک حد تک ٹیکسوں کی وجہ سے مزید مہنگائی ، خاص طور پہ کاغذ کی قیمت ۔ ڈاک خرچ پرنٹنگ کا بل وغیرہ شامل ہیں میں مزید اضافہ کا امکان ہے ادارہ اس وقت بھی بے انتہا مہنگا کاغذ خرید رہا ہے ۔ لیکن مسلسل بڑھتی ہوئی مہنگائی کی وجہ سے البلاغ کی قیمت میں مجبوراً وہ بھی صرف اور صرف لاگت کی حد تک اضافہ کرنے پر ادارہ مجبور ہو چکا ہے ۔ برائے مہربانی ماہ ذی الحجہ کے شمارے کا انتظار فرمایئے

کراچی کے حالات سے آپ سب حضرات واقف ہیں اس کے باوجود کرفیو اور ہنگاموں میں ادارہ کے کارکن حضرات انتہائی لگن سے اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں ۔ کئی دنوں سے پریس وغیرہ بند رہا جس کی وجہ سے ماہ ذیقعدہ کا شمارہ تاخیر سے چھپ رہا ہے اور کراچی میں ہنگاموں کی وجہ سے گذشتہ دس پندرہ دنوں سے جی پی او اور دوسرے ڈاکخانوں میں ڈاک کی ترسیل اور تقسیم رکی ہوئی ہے خدا کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ ہنگاموں میں نمایاں حد تک کمی واقع ہو گئی ہے دعا کیجئے اللہ تعالیٰ پاکستان کو اور پاکستان میں رہنے والے تمام مسلمانوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھیں ۔ آمین

والسلام

شجاعت علی ہاشمی

ناظم البلاغ ، دارالعلوم کراچی